ماہنامہ
گوجرانوالہ

فلاحِ آدمیت

Reg: CPL No. 80

MARCH 2008

مارچ
2008

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

صداقت

اللہ

محبت

سِلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پروازِ مسلسل

☆ موجودہ دور کے عظیم صوفی اور بانی سلسلہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی تعلیم کا علمبردار۔

☆ رُہبانیت اور شرک سے پاک اور قرآن وسنت کے عین مطابق راہ فقر کی تعلیم کا داعی۔

☆ وحدتِ اُمت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا ترجمان۔

☆ فرقہ واریت، غصہ اور نفرت ختم کر کے عالمگیر محبت اپنانے کا نقیب۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

منشورِ دعوت

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً
وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ
وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ط

الاعراف۔ 205

ترجمہ

اپنے رب کو اپنے دِل میں عاجزی اور ڈر کے ساتھ، اُونچی آواز نکالے بغیر، صبح و شام یاد کرو۔ اور غافلوں میں سے نہ ہونا۔

ماہنامہ

آدمیت
فلاح

گوجرانوالہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

بیادگار **خواجہ عبدالحکیم انصاری** رح

بانی سلسلہ

نگران وسرپرست

محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ
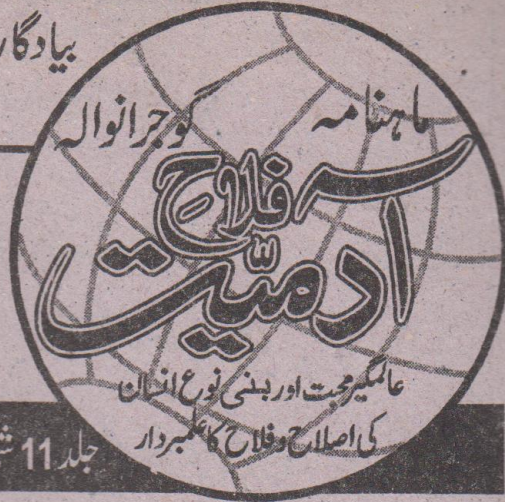
جلد 11 شمارہ 6 مارچ 2008ء، صفر 1429ھ

ایڈیٹر **وحید احمد**

سرکولیشن مینجر **میاں علی رضا**

قیمت ------ -/20 روپے

سالانہ فنڈ ------ -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:055-3862835
Mob: 0300-6493335

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:055-3881379
Mob:0300-7409533

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020
E-mail: info@toheedia.net

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

درس قرآن

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰؒ)

ظن وتخمین بمقابلہ ایمان ویقین

آخرت کے ذلت آمیز انجام سے بچانے کیلئے توحید کے دلائل کو ایک نئے اور اچھوتے انداز میں بیان کیا۔ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ رزق دنیا، زندگی اور موت کا مالک اور کائنات کی تدبیر کرنے والا اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔اوراس کی الوہیت کے اقرار سے ہٹ کر سب کچھ گمراہی وضلالت ہے۔اس کے بعد کچھ سوالات کئے گئے تا کہ مشرکوں کو تنبیہہ ہو۔ان سے پوچھا گیا کہ جن کی تم عبادت کرتے ہوان کی بابت بتاؤ کہ انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ راہِ راست کی رہنمائی کون کرنے والا ہے؟ اور پھر فرمایا کہ اکثر انسان اپنے اوہام وتصورات کی پیروی کرتے ہیں جبکہ:۔

ان الظن لا یغنی من الحق شیاءo

''بے شک خیالات (ظن وتخمین) سچائی کے مقابلے میں قطعاً مفید نہیں''۔(یونس :36)

انہی خیالات میں کھویا ہوا انسان حقیقت سے دور رہتا ہے۔جبکہ حقیقت وہ ہے کہ جس کو آج تک کوئی جھٹلا نہیں سکا اور اس کا نام ہے موت ۔صوفیاءِ کرام سے جب موت کی حقیقت پوچھی گئی تو اُنہوں نے اس کا مطلب یہ بتایا کہ محبّ اور محبوب کی ملاقات کا نام موت ہے۔کیونکہ اس کے بغیر انسان اپنے محبوب رب کو نہیں پاسکتا اور ہم اس محبوب کی جانب مسلسل سفر کر رہے ہیں۔اسی لئے جب ہم کہیں سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو جو دُعا پڑھتے ہیں،اس کے آخر میں بھی یہی کہتے ہیں۔

وانا الی ربنا لمنقلبونo

''ہم تو دراصل اپنے پروردگار کی طرف جارہے ہیں''۔(زخرف۔14)

گویا ہمارا حقیقی سفر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

''اے انسان! تو تکلیفیں اُٹھا اُٹھا کر اپنے پروردگار کی طرف بڑھ رہا ہے پس جان لے کہ

اس سے ملاقات ہو جائے گی''۔

اس ملاقات کی آس ہی میں ہم سب جی رہے ہیں۔ ہمارا اُٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا یہ سب کچھ اس کی اِسی ملاقات کی طلب میں ہے۔ کتنے بدنصیب ہوں گے وہ لوگ کہ جن کا کوئی محبوب ہی نہ ہو اور اس سے ملنے کی آس اور توقع ہی نہ ہو۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں یعنی قرآنِ مجید سے غافل ہیں، اُن کا آخری ٹھکانا جہنم ہوگا، ان برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ اپنے غلط عقیدے اور غلط طرزِ عمل کی وجہ سے کرتے رہے۔ یہاں یہ معلوم ہوا کہ اصل طاقت جو انسان کو نیک اعمال کی طرف لاتی ہے اور سوئے منزل لے کر چلتی ہے وہ اس کی محبت ہے جو اللہ کی خاطر وہ دل میں رکھتا ہے اور یہ اُمید ہے کہ ایک دن وہ اللہ کے حضور پہنچے گا، اللہ کو دیکھے گا، اس کے قُرب سے مُشرف ہوگا۔

یہ محبت کی دولت ہے اور اگر یہ حاصل ہو جائے تو اس دنیا میں اس سے بڑی اور کوئی چیز نہیں۔ یہی محبت کا رویہ انسان میں یقین و ایمان کی کیفیت پیدا کرتا اور اسے وہم و گمان، ظن و تخمین اور بے یقینی کی حالت سے باہر نکالتا ہے۔

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلام سے بتر ہے بے یقینی

دراصل بے یقینی وہم و گمان کی کیفیت میں اُلجھے رہنے کی کیفیت کو کہتے ہیں۔ قرآنِ مجید وہم و گمان کی کیفیت کو اچھا نہیں سمجھتا اور انسان کے اس علم کو جو وہ حواس محسوسہ سے آگے نہیں حاصل کر سکتا، اس کو وہم و گمان کے علم کا نام دیتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وماكان هذا القرآن ان يفترى من دون الله ولكن تصديق الذى بين يديه و تفصيل الكتب لا ريب فيه من رب العالمين ٥ ام يقولون افتره ۔ قل فاتوا بسورة مثله وادعوا من استطعتم من

دون اللّٰہ ان کنتم صدقینo

بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه ولما یاتهم تاویله ۔ کذلك کذب الذین من قبلهم فانظر کیف کان عاقبة الظالمینo

''حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ محض قیاس وگمان کے پیچھے چلے جارہے ہیں حالانکہ گمان حق کی ضرورت کو پورا نہیں کرتا ۔ یہ لوگ جو کچھ کررہے ہیں، اللہ اس کو خوب جانتا ہے اور یہ قرآن وہ چیز نہیں کہ جو اللہ کی وحی کے بغیر تصنیف و تالیف کرلیا جائے بلکہ یہ اور جو کچھ اس سے قبل نازل ہو چکا ہے، یہ قرآن اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے ۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کرلیا ہے؟ کہو اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ، اور اللہ کے علاوہ جس کو بھی چاہو، امداد کیلئے بلالو ۔ اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مال اور انجام بھی ان کے سامنے نہیں آیا، اس کو انہوں نے خواہ مخواہ اٹکل پچو سے جھٹلا دیا ۔ اسی طرح ان سے پہلے کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا'' ۔ (یونس: 37-39)

حب الٰہی حصولِ یقین کا ذریعہ ہے

ان کی اسی بے یقینی کی حالت پر تاسف کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر پہلی اُمتوں کی طرح یہ لوگ اس قرآن کی حقانیت کو تسلیم کرنے کی بجائے شک اور وہم میں مبتلا رہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی وہم میں مبتلا رکھیں تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ تمام زندگی قیاس اور وہم وگمان میں گزار دی جائے اور کہیں بھی یقین کی دولت حاصل نہ ہو، کہیں بھی دل کو قرار نصیب نہ ہو اور اطمینان نہ ہو کہ ہم ٹھیک سمت میں جارہے ہیں ۔ ہم کس کیلئے جی رہے ہیں، کوئی ہماری زندگی کا مالک ہے، کس نے ہمیں پیدا کیا، کوئی ہمارا ہے اور ہم کسی کے ہیں ۔

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زُلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

یعنی وہم وگمان کی اس کیفیت سے نکل کر اللہ کے ایمان کی کیفیت میں جانا چاہئے۔

اسی کومگو کی کیفیت میں مبتلا معاشرے کے افراد کا ذکر ہے کہ کچھ ایمان لاتے ہیں اور باقی کفر کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہیں۔ کچھ لوگ ہمہ تن گوش ہیں اور کچھ بات سننے کے بھی روادار نہیں۔ ایسے میں جب کوئی فرد موت سے ہمکنار ہوتا ہے تو اس کے احساسات یہ ہوتے ہیں کہ اس نے چند لمحے یا چند ثانئے ہی اس دنیا میں زندگی گزاری ہے اور اس کے ساتھ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ لوگ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان کیلئے فرمایا کہ دنیا میں انسان کتنی ہی زندگی کیوں نہ گزار لے، آخر کار اس کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہوگا۔ یہ بات سن کر انہوں نے پوچھا کہ اتنا بتا دیجئے کہ یہ عذاب کب آئے گا۔ اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ ان کو یوں جواب دے دیں:۔

قل لا املک لنفسی ضرا ولا نفعا الا ماشاء اللہ ۔ لکل اُمة اجل۔ اذا جاء اجلھم فلا یستاخرون ساعة ولا یستقدمونo

''کہہ دیجئے! کہ میں تو اپنے فائدے اور نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ (میرے لئے) چاہے۔ (رہا معاملہ عذاب کا سن لو کہ) ہر اُمت کیلئے (موت کا) ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی بھی دیر یا جلدی نہیں کر سکتے''۔ (یونس:49)

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ مجھے تو اپنے بارے میں ہونے والے معاملات کے خیر وشر کی خبر نہیں چہ جائیکہ میں تم پر آنے والے عذاب کی خبر دے سکوں۔ البتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر فرد وقوم کیلئے وقت متعین ہے کہ اس کو کب تک اس دنیا میں رہنا ہے۔ اور یاد رکھو کہ جب اجل سر پر آ پہنچے گی تو پھر یہ نامراد شخص تمنا کرے گا اے کاش! مجھ سے ساری دنیا لے کر بھی ایک ساعت عذاب سے چھٹکارا مل جائے مگر ایسا اس وقت ممکن نہ ہوگا۔ اس وقت یہ لوگ شرمندگی وندامت کے دریا میں غوطہ زن ہوں گے مگر اب اس پچھتاوے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

ولی اُللہ کون؟

اس کے بعد اب ولایت کا ذکر ہے اور اس کا معیار بتایا ہے کہ

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنونo

''یادرکھو کہ جواللہ کے دوست ہیں،انہیں نہ تو کوئی خوف ہوتا ہے نہ غم''۔(یونس:62)

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یقین کی دولت سے مالامال ہوتے ہیں اوران کی یہ پہچان بن جاتی ہے کہ۔

الذین امنوا وکانو ا یتقونo

''وہ ایمان لاتے اور گناہوں سے بچتے ہیں۔''(یونس:63)

یہاں پہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اولیا ءاللہ کی دو بنیادی صفات ہوتی ہیں:ایک یہ کہ وہ اہل یقین و ایمان ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اہل تقویٰ ہوتے ہیں۔یہی دو معیار ہیں جن سے کسی شخص کی ولایت کو پرکھا جاسکتا ہے:ایمان اور تقویٰ۔اگر یہ دو صفات نہ ہوں تو باقی سب شعبدہ بازی ہے،ولایت نہیں ہے۔اس محبت کیلئے راتوں کوکھڑے ہوکراس سے بھیک مانگنا پڑتی ہے۔دستِ سوال دراز کرنا پڑتا ہے کہ اپنی محبت عطا کردو۔اس لئے کہ وہ سب نعمتیں عطا کردیتا ہے جب کہ اپنی محبت،قرب،ایمان اور محبت بغیر مانگے،بن طلب کئے نہیں دیتا لیکن یوں اس سے بھیک مانگنے کے بعد جب اس سے محبت ہوجاتی ہے تو اس کی محبت کا ادراک ہونے لگتا ہے۔اس کے وجود کا احساس ہونے لگتا ہے اور پھر یقیناً ایمان حاصل ہوجاتا ہے۔اس لئے فرمایا کہ''یہ وہم و قیاس کی کیفیت سمٹ کر یقین کی منزل جب حاصل ہوجاتی ہے تو ولایت حاصل ہوجاتی ہے لیکن اس کی دو بنیادیں ہیں،جن میں یہ دو علامتیں ہوں گی،وہ ہمارے ولی اور دوست ہوں گے اور ولی وہ لوگ ہیں،جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ایمان اور تقویٰ جس شخص کے اندر موجود ہوگا،وہ اللہ کا ولی ہوگا۔ولایت کیلئے شعبدے بازی شرط نہیں ہے۔ولایت کیلئے ہواؤں میں محو پرواز ہونا،پانی پہ چلنا کوئی لازمی شرط نہیں بلکہ یہ تو اس بات کا نام ہے کہ اللہ پر ایمان ہو اور سرورکائنات حضرت محمدﷺ کی ذات سے گہرا تعلق ہو۔اتنا تعلق کہ انسان اپنے آپ کو ان کے رنگ میں رنگ دے۔ان کی اداؤں پر مرمٹے،ان کی زندگی کو اپنالے،اور اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

دن رات کا آنا نظام رحمت ہے

اس ولایت کے حصول کیلئے اس کے بعد کی آیات میں ایک مرتبہ روزانہ مشاہدہ میں آنے والی چیزوں کے ذریعے سے وہ محبوب حقیقی اپنا تعارف کراتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

ھوالذی جعل لکم الیل لتسکنوا فیه والنھار مبصرا ان فی ذالك لایت لقوم یسمعون٥

"اللہ تعالیٰ وہ ذات گرامی ہے جس نے رات بنائی تمہارے لئے تا کہ تم اس میں آرام کرو۔ دن کو روشن بنایا۔ اس بات میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو ہماری بات کو غور سے سن رہے ہوں"۔(یونس:67)

یہ رات کا آنا بھی لطف کی بات ہے۔ راقم کو زمانہ طالب علمی میں جب مطالعہ کرتے ہوئے دیر ہو جاتی تو والدہ مرحومہ کی مامتا برداشت نہیں کرتی تھی۔ وہ آ کے بتی بجھا دیتیں کہ بس بیٹا! اب سو جاؤ یہ بھی تو اللہ کی رحمت ہے کہ شام کو بتی بجھا دیتے ہیں کہ دن میں بہت کام کیا ہے، تمہارا جسم اور اعصاب تھک چکے ہوں گے۔ اب سورج غروب کر کے بتی بجھا دی۔ اب تم آرام کرو۔ نیند کر لو اور کل اس آرام کے نتیجے میں جب پھر طبیعت تازہ دم ہو جائے گی تو پھر تمہیں روشنی دیں گے کہ اس کھلی روشنی میں ہل چلاؤ اور اس میں کاروبار کرو۔

آپ غور فرمائیں کہ اگر ساری دنیا کے انسان مل کر اس امر کا فیصلہ کرنے کی کوشش کرتے کہ انہیں کب آرام کرنا ہے اور کب کام تو کبھی ایک وقت پر متفق نہ ہو پاتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کیسا انتظام ہے کہ ہم سب لوگ ایک ہی وقت میں کام کرتے ہیں، ایک ہی وقت میں کھانا کھاتے ہیں، اور ایک ہی وقت سو جاتے ہیں۔ یہ اسی کا بنایا ہوا نظام ہے۔ رات اور دن کے آنے جانے سے ہمارے کام کرنے، کھانا کھانے اور سونے جاگنے کے اوقات ایک ترتیب میں آ جاتے ہیں۔ یہ نشانیاں ان لوگوں کیلئے ہیں جو باتیں دل کے کانوں سے سنیں۔ اور یہ یقین ان کے دل میں جاگزیں ہو جائے کہ یہ رات دن کا آنا اور دنیوی زندگی محدود عرصے کیلئے نفع اُٹھانے کی غرض سے

ہے، یہ مستقل اور پائیدار چیز نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سبھی کو لوٹ کر اپنے خالق کے حضور پیش ہونا ہے۔

بعض انبیاء کے حالات

اولیاء اللہ کا ذکر اجمالی طور پر تو ہو چکا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اور دوستوں میں سے چند کے حالات بطور نمونہ ذکر فرماتے ہیں۔ پہلے سیدنا نوح علیہ السلام کا ذکر ہے۔ کہ قوم نے جس قدر اذیتیں اور مصائب ان کو دیئے انہوں نے سب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور بتایا کہ میرا کام اللہ کی نصیحت کو پہنچانا ہے اور مصائب آئیں تو اپنے مالک پر بھروسا کرنا۔ اس کے بعد اب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آ رہا ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو آزاد کرانے کیلئے سب جتن کئے، فرعون کے سامنے دین حق اور پھر معجزات پیش کئے، دلائل کے انبار لگا دیئے۔ ہر طریقے اور حکمت سے تحریک اسلامی کو آگے بڑھایا، لیکن فرعون، قارون، ہامان وغیرہ (شیطانوں کی تکون) نے کوئی بات نہ مانی۔ اس پر اللہ کے رسول نے تنگ آ کر بددعا دی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دردمندانہ الفاظ میں مخاطب ہوئے۔ ذرا ان کے الفاظ کو ملاحظہ کیجئے اور قرآن کی ادبیت کی داد دیجئے۔

وقال موسیٰ ربنا انك اتيت فرعون وملاه زينة واموالا فی الحيوة الدنيا ـ ربنا ليضلوا عن سبيلك ربنا اطمس علی اموالهم واشدد علی قلوبهم وفلا يومنوا حتی يروا العذاب الاليم ο قال قد اُجيبت دعوتكما فاستقيما ولا تتبعن سبيل الذين لا يعلمونο

وجاوزنا ببنی اسرائيل البحر فاتبعهم فرعون وجنوده بغيا وعدوًا حتی اذا ادركه الغرق قال امنت انه لا اله الا الذی امنت به بنوا اسرائيل وانا من المسلمينο

الئن وقد عصيت قبل وكنت من المفسدينο

فاليوم ننجيك ببدنك لتكون لمن خلفك اية وان كثيرًا من الناس عن ايتنا لغفلونο

''موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی، اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کی سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نوازے رکھا ہے۔ اے رب! کیا یہ اس لئے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں۔ اے رب! ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر لگا دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا تم دونوں کی دُعا قبول کی گئی (دُعا میں ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام بھی شامل تھے) ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر میں گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اُس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اُٹھا کہ معبودِ حقیقی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔ جواب دیا گیا: اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے قبل تو تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ وہ بعد کی نسلوں کیلئے نشانِ عبرت بنے۔ اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں''۔

فرعون کی لاش ۔۔۔ ایک عظیم معجزہ

یہ فرعون کی لاش کا معاملہ بھی عجیب و غریب ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اے فرعون! تیری لاش کو بچا کے رکھا جائے گا تاکہ آئندہ انسانی نسلوں کیلئے تو عبرت کا سامان بن جائے۔ دُنیا ہم سے سوال کرتی تھی کہ فرعون کی لاش کہاں ہے؟ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے پاس جواب نہیں تھا اور ہم یہ کہتے تھے کہ اس کی لاش ضرور کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ اسے ڈھونڈنا چاہئے۔ 1907ء میں یہ لاش دریافت ہوگئی اور اس وقت دنیا میں نشانِ عبرت کے طور پر موجود ہے، کچھ عرصہ مصر میں رہی۔ پھر برٹش میوزیم بھجوا دی گئی۔ لیکن یہ قرآنِ مجید کے سچا ہونے کا ثبوت ہے۔ لوگ اب بھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ جب قرآن نازل ہو رہا تھا تو اس وقت انسانوں کو معلوم نہیں تھا کہ یہ لاش کہاں ہے؟ لیکن قرآن نے آواز دی کہ یہ لاش محفوظ ہے اور وہ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی ضرور دریافت ہوگی۔ آخر کار وہ تیرہ سو سال کے بعد 1907ء میں

دریافت ہو گئی۔اس سے بڑھ کر قرآن کا اور کیا معجزہ ہو سکتا ہے؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ قرآنِ حکیم اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے؟

اس عظیم معجزے کے ذکر کے بعد ایک اور برگزیدہ نبی سیدنا یونس علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر ہے۔جس میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس قوم کیلئے اللہ تعالیٰ نے عذاب کی علامات ظاہر کر دیں کہ اس کو دیکھ کر رجوع کرلیں اور جب ان لوگوں نے رجوع کرلیا تو عذاب چھٹ گیا۔اور وہ ایمان کی زندگی کے ساتھ پھر جئے۔آج ہم جس قدر مشکلات اور آزمائشوں کا شکار ہیں،ان سے نکلنے کا ایک ہی حل اور لائحۂ عمل ہمارے لئے مفید ہے کہ ہم اپنے رب کی جانب رجوع کرلیں۔ سورۃ کا اختتام ہو رہا ہے اور اس سورہ کے آخر میں توحید اور اخلاص موضوع ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وان اقم وجهك للذين حنيفاً ولا تكونن من المشركين ٥ ولا تدع من دون اللّٰه مالا ينفعك ولا يضرك فان فعلت فانك اذا من الظلمين٥

وان يمسسك اللّٰهُ بضر فلا كاشف له الا هو وان يردك بخير فلا راد لفضله يصيب به من يشاءُ من عباده وهو الغفور الرحيم٥

’’(مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ) تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اس دین پر قائم کردے اور ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو اور اللہ کو چھوڑ کر کسی بھی ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان۔اگر تو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہوگا۔اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں۔وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے ،اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا ہے‘‘۔(یونس 105-107)

اللہ تعالیٰ ہماری حالتِ زار پر بھی رحم فرمائے۔آمین!

کس گروہ میں؟--- ایک فیصلہ کن سوال!

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

جب آپ دیکھیں کہ آپ کی بستی اور آپ کے سماج میں ہر طرف کھلم کھلا خدا کی نافرمانیاں ہو رہی ہیں اور اجتماعی برائیاں وبائے عام کی طرح ہر طرف پھیل گئی ہیں تو ایسے حالات میں آپ کیا کریں؟ آیا اپنی انفرادی نیکی پر قانع ہو کر اجتماعی برائیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو کر بیٹھ رہیں یا برائیوں کے مقابلے میں مردانہ وار کھڑے ہو کر انہیں مٹا ڈالنے کیلئے کمر بستہ ہو جائیں۔ یہ ایک نہایت بنیادی اور فیصلہ کن سوال ہے۔ آپ کے دین و ایمان کی آزمائش کا سوال ہے۔ آپ اپنے عمل سے اس سوال کا جو جواب دیں گے اور جو رویہ اختیار کریں گے۔ آپ کا یہ رویہ آپ کی دینی شخصیت کی نوعیت اور دین سے آپ کے تعلق کی وضاحت کیلئے فیصلہ کن ہو گا۔ آپ کا رویہ ہی بتائے گا کہ آپ حق پرست ہیں، یا حق فراموش، دین کیلئے مخلص ہیں، یا مطلب پرست، رب کے وفادار ہیں یا بے وفا، خدا اور دین کیلئے چوٹ کھانے والے مجاہد ہیں، یا جان بچانے اور راہِ فرار اختیار کرنے والے فرد۔ اور پھر اسی کی بنیاد پر یا تو آپ اپنے رب کریم کی بے پایاں نوازش و عنایت کے مستحق قرار پائیں گے یا رسوائی اور عذاب کے۔

وباء زدہ بستی میں تین گروہ:۔

جب کسی بستی میں عام ضمیر مردہ ہونے لگتے ہیں، اللہ اور یوم آخرت سے لوگ غافل ہو جاتے ہیں اور برائیاں طوفان کی طرح پھیل جاتی ہیں تو بالعموم ایسی وباء زدہ بستی کے لوگوں میں تین قسم کے گروہ بن جاتے ہیں۔ ایک وہ جو خدا فراموش ہوتے ہیں اور کھلم کھلا خدا کی مقرر کردہ حدود توڑتے ہیں اور گناہوں میں لت پت ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں جو اپنی حد تک گناہ اور نافرمانی سے بچنے پر قانع ہوتے ہیں اور انہیں گناہ یا گناہ کرنے والوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، اور تیسری خدا کے وہ مجاہد سپاہی ہوتے ہیں جو اس عزم کے ساتھ میدان میں اُترتے ہیں کہ جب تک ہمارے شانوں پر ہمارا سر موجود ہے ہم خدا کی زمین میں خدا کے باغیوں کو من مانی نہیں کرنے دیں گے۔ یہ خدا کے بھی وفادار رہتے ہیں اور بندوں کے بھی خیر خواہ۔۔ ان تین

گروہوں میں سے پہلے گروہ کا معاملہ بھی واضح ہے کہ یہ خدا کے غضب کو بھڑکانے والا ہے اور عذاب شدید کا مستحق ہے اور تیسرے گروہ کا معاملہ بھی بالکل روز روشن کی طرح صاف ہے کہ یہ وفادار گروہ یقیناً خدا کے انعامات کا مستحق ہے اور اس لائق ہے کہ نجات و کامرانی سے نوازا جائے۔ سوال دوسرے گروہ کا ہے کہ اس کا شمار کس میں ہوگا؟

اس گروہ کا ذہن یہ ہے کہ آدمی اپنی حد تک برائیوں سے بچا رہے پرہیز گاری کی زندگی گزارے۔ ذکر عبادت کرتا رہے۔ اپنی ذاتی نیکی پر قناعت کرے۔ سماج کے ناہنجاروں اور بدکاروں سے تعلق نہ رکھے۔ بدکردار، فاسقوں اور ظالموں کے برے کرتوتوں پر کڑھنے، سوچنے اور ان سے اُلجھنے میں اپنا وقت عزیز ضائع نہ کرے۔ دنیا سے بگاڑ مول لینے اور خواہ مخواہ خدا کے باغیوں اور سرکشوں کو اپنے پیچھے لگانے کے بجائے محفوظ دیندارانہ زندگی گزارتا رہے۔ یہ ذہن گویا برائیوں اور برائی کرنے والوں سے بے تعلقی اور مصالحت کا ذہن ہے۔ برے لوگوں کے مقابل میں آنے کے بجائے برائیاں گوارا کرتے رہنے کا ذہن ہے۔ معاشرے پر اثر انداز ہونے کے بجائے معاشرے کو شیطان کے حوالے کر دینے اور شیطانی قوتوں سے خود کو مامون و محفوظ رکھنے کا ذہن ہے۔ بظاہر تو یہ ذہن بڑا سلامتی پسند، بے ضرر اور شر بیزار قسم کا معلوم ہوتا ہے اور اس کی معصومیت پر ترس کھانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ لیکن آپ اگر ذرا مومنانہ فراست اور دینی بصیرت کے ساتھ اس ذہن کو پڑھیں اور اس کردار کا جائزہ لیں تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ دینی غیرت و حمیت سے محرومی کا ذہن ہے، یہ دینی بے حسی، اخلاقی کمزوری اور اپنے رب سے بیوفائی کا ذہن ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس ذہن کا تجزیہ کریں یا دینی فہم و بصیرت سے کام لیں یا تاریخی شہادتوں پر غور کریں تو آپ کو شرح صدر حاصل ہوتا جائے گا کہ یہ ذہن خدا کے وفادار مجاہد اور خدا سے اپنے جان و مال کا سودا کرنے والے باشعور مومنوں کا ذہن نہیں ہو سکتا۔ یہ اس تھڑدلے، بزدل اور بے وفا گروہ کا ذہن ہے جو خدا اور دین کیلئے کوئی چوٹ کھانے کی ہمت نہیں رکھتا اور کسی ایسی نرم اور ہموار راہ سے خدا کی جنت کا مستحق بننے کے خواب دیکھتا ہے جہاں اس کے پاؤں کے تلووں میں کوئی کانٹا بھی چبھنے نہ پائے۔

بھلائی قائم کرنے کیلئے برائی سے جنگ ناگزیر ہے:

اگر آپ کو روشنی پیاری ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ روشنی پھیلی رہے آپ کو تاریکی سے نفرت ہے اور ہرگز نہیں چاہتے کہ تاریکی پھیلے تو آپ کو تاریکی سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ اسے روکنے کی کوشش کرنی ہوگی اور یہ ایک روشن حقیقت ہے، جس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ جہاں جہاں آپ نے تاریکی کو گوارا کرلیا۔ وہاں وہاں آپ نے لازماً روشنی کے مٹنے کو گوارا کرلیا۔ اگر سچ آپ کو عزیز ہے تو آپ کو کوشش کرنی ہوگی کہ جھوٹ نہ پنپنے پائے اور زندگی کے جس جس گوشے میں آپ نے جھوٹ گوارا کرلیا ہے آپ نے یقیناً زندگی کے اس اس گوشے سے سچ کو رُخصت کر دیا ہے۔ زندگی کے جن انفرادی یا اجتماعی شعبوں میں باطل کی حکمرانی ہے وہاں حق مغلوب ہے جہاں جہاں باطل آ گیا ہے حق مٹ گیا ہے۔ آپ اگر باطل کے آنے پر رضامند ہیں تو اس کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آپ حق کے مٹنے پر راضی ہیں اور حق کے مٹنے پر راضی رہ کر بھی اگر آپ حق کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں تو آپ کھلے فریب میں مبتلا ہیں۔ باطل سے مصالحت کا ایک ہی لازم مفہوم صحیح ہے۔ باقی سب غلط ہیں کہ آپ حق کی پامالی اور تباہی پر مطمئن ہیں جہاں برائی کا دور دورہ ہے وہاں بھلائی دب چکی ہے یا مٹ چکی ہے اور برائی کو برداشت کرنے کا مطلب صرف یہی ہے کہ بھلائی کا دبنا یا مٹنا آپ کو گوارا ہے۔

خدا کی نافرمانیوں اور باغیوں کے علانیہ خدا کے حدود توڑنے کیلئے چھوڑ دینا، بے حیاؤں اور بداخلاقوں کو کھلم کھلا اپنے نفس کی گندگی اُچھالنے اور پھیلانے کیلئے موقع دینا، اور ان کی راہ میں ذرا رکاوٹ نہ بننا، خدا سے محبت اور وفاداری نہیں بلکہ خدا سے بے وفائی اور بے غیرتی ہے۔ یہ رویہ انہی کا ہوسکتا ہے جن کی دینی حس مردہ ہو چکی ہو۔ جن کے ضمیر کا گلا گھونٹ چکا ہو اور جو بڑی دینی بصیرت سے قطعی محروم ہو چکے ہوں۔ خدا کی نافرمانیاں جب وبائی امراض کی طرح پھیلیں گی اور برائیاں طوفان کی طرح چھا جائیں گی تو یہ خیالِ خام ہے کہ آپ کی پرہیز گاری کی زندگی محفوظ رہ جائے گی اور اس پر کوئی آنچ نہ آئے گی بلکہ اس کے برعکس آپ کی نیکی بے اثر ہوتی جائے گی، برائی کا دباؤ بڑھتا جائے گا اور آخر کار آپ برائیوں کے مقابلے میں مجبور و بے بس ہو کر

رہ جائیں گے۔

اگر آپ کو واقعی حق سے محبت ہے۔آپ خدا اور دین کے وفادار ہیں۔بھلائی اور نیکی کو آپ دل سے چاہتے ہیں تو حق کی غیرت، رب کی وفاداری اور دینی فہم وبصیرت کے ساتھ یہ ممکن نہیں کہ آپ کے دل میں برائی کے خلاف سخت نفرت نہ ہو۔خدا کی نافرمانی اور بغاوت کے خلاف بیزاری کے جذبات نہ ہوں۔ یہ قطعاً قابل تصور نہیں کہ بستی میں ہر طرف برائیاں چھائی جارہی ہوں،خدا کی نافرمانیاں اعلانیہ ہورہی ہوں،لوگ ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ خدا کے دین کی حدود کو توڑ رہے ہوں،شریعت کو پامال کر رہے ہوں،سنتیں مٹ رہی ہوں اور آپ گوشہ عافیت میں مطمئن اپنی شخصی نیکی پر قناعت کیے بیٹھے ہوئے ہوں اور آپ کو ذرا بے چینی اور بے قراری نہ ہو۔یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کے دل میں خدا سے وفاداری اور دین سے محبت ہو لیکن حق کی پامالی پر کوئی کڑھن اور اضطراب نہ ہو اور آپ کے حق پسند سینے میں کوئی ایسی لہر نہ اُٹھ رہی ہو جو آپ کو حق کی حمایت میں برائیوں کے خلاف اُٹھا کھڑا کرے اور یہ تو دینی بے حسی کی انتہا ہے۔اگر کچھ لوگ اپنی غیرت ایمانی سے بے حیاؤں کو ان کے کرتوتوں سے روکیں اور برائیوں کو کچلنے اور مٹانے کیلئے مجاہدانہ عزائم کا اظہار کریں تو آپ نہ صرف یہ کہ ان سے بے تعلق رہیں، ان کی کوششوں اور کاوشوں کو خاطر میں نہ لائیں بلکہ اُلٹا انہیں اس جہاد اور احیائے دین سے باز رکھنے کی کوشش کریں اور انہیں یہ ذہن وفکر دینے کی کوشش کریں کہ خواہ مخواہ نالائق فاسقوں کے پیچھے کیوں پڑ رہے ہو، یہ نافرمان تو اب اسی لائق ہیں کہ عبرت ناک سزا سے دو چار ہوں۔یہ ماننے والے نہیں ہیں، ان کو کچھ بتانا اور سمجھانا بے سود ہے۔جاؤ اللہ اللہ کرو، اپنی عاقبت کی فکر کرو اور ان ظالموں اور فاسقوں اور نافرمانوں کے پیچھے نہ پڑو۔۔۔بے شک یہ مشورے بظاہر تو بڑے معصوم اور دیندارانہ جھلک لیے ہوئے محسوس ہوتے ہیں مگر یہ خدا کے سپاہیوں کے جذبات سرد کرنے والے مشورے ہیں۔مجاہدوں کو جذبات کی گرمی سے محروم کرنے والے مشورے ہیں، یہ میدان میں اُترے ہوئے سپاہیوں کو راہِ فرار دکھانے والے مشورے ہیں، یہ خدا کے وفاداروں کو بے وفائی سکھانے والے مشورے ہیں، یہ مشورے قرآن وسنت کے بھی خلاف ہیں عقل ودانش کے

بھی خلاف ہیں اور تاریخ بھی اسکے خلاف شہادت دیتی ہے۔

آیئے قرآن حکیم کی روشنی میں اس مسئلہ کو سمجھنے اور شرح صدر حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

قرآن حکیم نے بنی اسرائیل کی تاریخ سے ایک نمونہ عبرت ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور نہایت اختصار مگر انتہائی حکیمانہ اور دلنشین انداز میں بتایا ہے کہ برائیوں کے طوفان میں ایک مومن کیلئے صحیح ذہن کیا ہے؟ ایسے حالات میں کونسا طرز فکر وعمل پسندیدہ، مطلوب اور قابل نجات ہے اور کونسا طرز فکر وعمل ناپسندیدہ، غیر مطلوب اور موجب غضب وعذاب ہے، قرآن بنی اسرائیل کا ایک عبرت آموز واقعہ بیان کر کے یہی بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔

''اور ان سے اس بستی کا حال معلوم کرو جو سمندر کے کنارے واقع تھی، جب کہ بستی والے سبت کے روز احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے، جب کہ سبت کے روز ان کے شکار کی مچھلیاں منہ اٹھائے سمندر پر آجاتی تھیں اور باقی دنوں میں وہ غائب ہو جاتی تھیں۔ اس لئے کہ ہم ان کی پیہم نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے اور انہیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا، تم ایسے لوگوں کو نصیحت وفہمائش کیوں کیے جا رہے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت عذاب دینے والا ہے، تو انہوں نے جواب دیا، یہ اس لئے کہ تمہارے رب کے حضور ہم معذرت پیش کر سکیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ نافرمانی سے باز آجائیں۔ آخر کار جب وہ لوگ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھے جن کی یاددہانی ان کو کرائی جارہی تھی۔ تو ہم نے ان میں سے ان لوگوں کو عذاب سے بچالیا، جو ان نافرمانوں کو برائیوں سے روک رہے تھے اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے، ان کی پیہم نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑلیا''۔ (الاعراف: ۱۶۲۔۱۶۳)

قرآن کے اس بیان سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ بستی کی عظیم اکثریت ہی نافرمان ہو گئی تھی۔ البتہ کچھ دردمند دل رکھنے والے لوگ بھی تھے جنہیں اپنی داعیانہ حیثیت کا شعور تھا کچھ دوسرے لوگ تھے جنھیں اپنی دینداری کا احساس بھی تھا۔ وہ اپنی دینداری پر مطمئن بھی تھے اور انہیں یہ زعم بھی تھا کہ علم وآگہی بھی رکھتے ہیں لیکن وہ دعوتی جذبے سے نہ صرف محروم تھے بلکہ وہ

دعوت وتبلیغ کے حق میں ہی نہ تھے۔ ان تین قسموں کے گروہوں کا عمل اور ذہن سامنے لا کر قرآن نے بڑے واضح انداز میں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی ہے کہ برائیوں کے طوفان میں ایک مومن کا ذہن وفکر کیا ہونا چاہیے۔

قصے کی تفصیلات جو قرآن نے بیان کی ہیں ان سے بہت صاف ستھرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس بستی میں تین قسم کے لوگ موجود تھے۔

نافرمان گروہ:

ایک وہ جو کھلم کھلا نافرمانی اور گناہوں میں مبتلا تھے اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ اللہ کے حدود پامال کر رہے تھے، انہی کی طرف اشارہ ہے۔ ”جب یہ لوگ احکام سبت کی خلاف ورزی کر رہے تھے“۔

فرض شناس گروہ:

دوسرے وہ لوگ تھے جو اِن کی بے حیائی اور سرکشی سے سخت نالاں تھے۔ ساتھ ہی اپنے فریضے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی پورا پورا شعور رکھتے تھے اور انتہائی دلسوزی، دردمندی اور جرأت وہمت کے ساتھ وہ اپنا یہ فریضہ انجام دے رہے تھے اور بستی کے سرکشوں کو وعظ وتلقین اور نصیحت وتذکیر کرتے رہتے تھے اور برائیوں سے روک رہے تھے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے ان کے حسن انجام کو اس فقرے میں بیان کیا ہے کہ ”ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو دوسروں کو برائی سے روکتے تھے“

قرآن کریم کی یہ وضاحت کہ ہم نے نجات دی، ان لوگوں کو جو برائیوں سے روک رہے تھے“۔ خاص طور پر پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔

فرض سے غافل گروہ:

ایک تیسرا گروہ تھا، جو خود برائیوں میں مبتلا نہ تھے اور برائیوں کے برے انجام اور عذاب و ہلاکت کا شعور رکھتا تھا اور خوب اچھی طرح واقف تھا کہ ان کرتوتوں کا انجام ہلاکت ہے یا شدید ترین عذاب مگر انہیں اپنی ذمہ داری کا شعور نہ تھا، یہ اپنی ذاتی نیکی پر قناعت کئے ہوئے تھے اور

ماحول کی خرابیوں سے انہیں غرض نہ تھی۔ نہ ان کے اندر یہ ہمت و جرأت تھی کہ نافرمانوں کو للکار سکیں اور نہ انہیں یہ گوارا تھا کہ کوئی دوسرا انہیں چھیڑے۔ دراصل یہ دین کے صحیح تصور اور اس کے واضح تقاضوں سے ناآشنا اور غافل تھے، یہ اپنے خول میں سمٹے رہنا چاہتے تھے، یہ مایوسی کا شکار تھے ان کی نادانی اور بے حسی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی، کہ خدا کے جو وفادار سپاہی برائیوں کے خلاف آواز اُٹھا رہے تھے، اور برائیوں کے خلاف مجاہدانہ کوشش کر رہے تھے۔ یہ گروہ انہیں بھی اس فریضے سے روکتا اور کہتا تم ان ناہنجاروں کو کیوں تلقین کیے چلے جا رہے ہو، ان کو سمجھانے کا کیا فائدہ۔ ان کو ہلاک کرنے کا تو اللہ نے فیصلہ کرلیا ہے اس بے حمیت، غافل اور شکست خوردہ ذہن کی ترجمانی قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے۔ اور تیسرے گروہ کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔ ''تم ایسے لوگوں کو نصیحت و تلقین کیوں کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت ترین عذاب دینے والا ہے''۔

اقامت دین کے فریضے سے غافل یہ گروہ کچھ اس دور کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا، بلکہ یہ مخلوق ہر دور میں پائی جاتی ہے۔ آج بھی یہ گروہ موجود ہے۔ یہ اپنے دینداری کے خول میں سمٹا ہوا، اپنی خدا شناسی کے زعم میں مبتلا اپنے طرز فکر و عمل ہی کو اصل دین سمجھتا ہے۔ اور اپنے تصور کے تحت خود ہی کو برسر حق تصور کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن نے اس گروہ کا کیا انجام بتایا ہے اور اس ذہن کے بارے میں کیا فیصلہ دیا ہے؟

قرآنِ حکیم نے اس عذاب زدہ بستی کے تین گروہوں کے مختلف طرزِ فکر و عمل کی وضاحت کے بعد ان تینوں کے تین انجام بیان کرنے کے بجائے صرف دو انجام بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ برائیوں سے روکنے والوں کو نجات دی گئی۔ دوسرا یہ کہ ظلم کرنے والے نافرمانوں کو سخت عذاب میں پکڑ لیا گیا رہا تیسرا گروہ جو اپنی حد تک تو گناہوں اور نافرمانیوں سے بچتا رہا۔ لیکن دوسروں کو روکنے کے فریضے سے غافل رہا۔ بلکہ جو لوگ نہی عن المنکر کا یہ فریضہ انجام دے رہے تھے۔ ان کو بھی روکتا رہا۔ اس گروہ کا انجام کیا ہوا۔ اس بارے میں دو ہی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ اور ردو میں سے ایک بات کا ماننا ناگزیر ہے۔ یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن حکیم نے اس گروہ کا انجام بیان ہی

نہیں کیا ہے۔اور دانستہ ان کے انجام کی طرف سے سکوت اختیار کیا ہے اس لئے کہ قرآن کے سلسلے میں بھول اور ذہول کا تو سوال ہی نہیں، یہ رب العالمین کا کلام ہے، اور وہ بھول و ذہول جیسی کمزوریوں سے پاک و برتر ہے لیکن قرآن کا تو موضوع ہی یہ ہے کہ نیک عمل کا حسن انجام بیان کر کے بشارت دے اور برے عمل کا انجام بد بیان کر کے انذار کرے۔قرآن کے بارے میں یہ بات ہرگز نہیں کہی جاسکتی کہ وہ ایک گروہ کے عمل و کردار کی وضاحت تو کرے۔لیکن یہ نہ بتائے کہ یہ عمل پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ اور اس عمل کے صلے میں وہ انعام و اکرام کا مستحق ہے، یا پاداش میں عذاب وغضب کا۔

یا پھر یہ تسلیم کیا جائے کہ برائیوں سے نہ روکنے والے اس گروہ کا انجام بھی انہی ظالموں کے ساتھ ہوا جو کھلم کھلا نافرمانی میں مبتلا تھے۔مگر یہ ایک سنگین فیصلہ ہے، زبان و قلم پر تقویٰ کی مضبوط گرفت قائم رکھتے ہوئے پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ یہ بات اسی وقت کہی جاسکتی ہے جب قرآن و سنت کی واضح تصریحات سے اس کی تائید و توثیق ہوتی ہو اور اس کی پشت پر مضبوط دلائل موجود ہوں۔

نزول عذاب کے وقت صرف دو ہی گروہ ہوتے ہیں:

کسی بستی کے بارے میں جب اللہ کی طرف سے عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو بسی کے رہنے والے سارے لوگ عملاً دو ہی گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، ایک وہ جو نجات پاتے ہیں، دوسرے وہ جو مبتلائے عذاب کر دیئے جاتے ہیں، دنیوی عذاب کے نزول کی صورت میں تیسرا کوئی گروہ نہیں ہوتا، اور نہ اس کا ہونا سمجھ میں آتا ہے۔اب اس آیت میں قران صاف صاف کہتا ہے کہ ہم نے نجات صرف اس کو دی جو برائیوں سے روک رہا تھا۔اس وضاحت کا مطلب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ بستی کے باقی لوگ سب عذاب میں مبتلا کئے گئے۔خواہ وہ خود گناہوں میں مبتلا لوگ ہوں یا وہ ہوں جو گناہوں کے ماحول میں رہنے پر رضامند تھے اور اس کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت سے محروم تھے یا اصلاح حال سے مایوس تھے۔

پھر قرآن کے اس فقرے ''تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کیلئے'' سے بھی

اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ جب فرض شناس گروہ نے نافرمانوں کواس کے کرتوتوں سے روکا تو فرض سے غافل گروہ نے ان سے کہاتم ان ہلاک ہونے والے عذاب زدہ لوگوں کو کیوں نصیحت کیے جارہے ہو، اس کے جواب میں انہوں نے کہا، ''تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کیلئے''، یعنی کل حشر کے میدان میں خدا کی پکڑ سے بچانے والی چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو یہ عذر ہو سکتا ہے کہ پروردگار ہم اس معصیت اور نافرمانی پر ہرگز رضامند نہ تھے۔ بلکہ ہم آخر تک ان لوگوں کو اس سے روکتے رہے۔ اس فقرے سے نہ صرف یہ کہ اوپر کی بات ہی کی تائید ہوتی ہے۔ بلکہ اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ آخرت میں خدا کی پکڑ سے بچانے والی چیز یہ عذر ہی ہو گا کہ ہم نہی عن المنکر کا فریضہ برابر انجام دیتے رہے۔ ایک دوسرے مقام پر تو قرآن نے اس حقیقت کو بالکل ہی واشگاف اور غیر مبہم انداز میں بیان کر کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہنے دی ہے۔ سورہ انفال آیت ۲۵ میں ہے: ''اور ڈرو اس فتنے سے جس کے وبال میں خصوصیت سے صرف وہی لوگ مبتلا نہ ہوں گے جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہے''۔

ایک بلند پایہ تفسیر میں اس بارے میں جو نوٹ لکھا ہوا ہے۔ وہ بڑا ہی بصیرت افروز بھی ہے اور اپنے مدعا کی وضاحت میں بڑا موثر بھی۔

''اس سے مراد وہ اجتماعی فتنے ہیں جو وبائے عام کی طرح ایسی شامت لاتے ہیں جس میں صرف گناہ کرنے والے ہی گرفتار نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ بھی مارے جاتے ہیں جو گنہگار سوسائٹی میں رہنا گوارا کرتے رہے ہوں، مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ جب تک کسی شہر میں گندگیاں کہیں کہیں انفرادی طور پر چند مقامات پر رہتی ہیں ان کا اثر محدود رہتا ہے اور ان سے وہ مخصوص افراد ہی متاثر ہوتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے جسم اور اپنے گھر کو گندگی سے آلودہ کر رکھا ہو۔ لیکن جب وہاں گندگی عام ہو جاتی ہے اور کوئی گروہ بھی سارے شہر میں ایسا نہیں ہوتا جو اس خرابی کو روکنے اور صفائی کا انتظام کرنے کی سعی کرے تو پھر ہوا اور زمین اور پانی ہر چیز میں سمیت پھیل جاتی ہے اس کے نتیجہ میں جو وبا آتی ہے، اس کے لپیٹ میں گندگی پھیلانے والے اور گندہ رہنے والے اور گندہ ماحول میں زندگی بسر کرنے والے سب ہی آ جاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی

نجاستوں کا حال بھی ہے اگر وہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود رہیں اور صالح سوسائٹی کے رعب سے دبی رہیں تو اس کے نقصانات محدود رہتے ہیں۔لیکن جب سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر کمزور ہو جاتا ہے۔جب اخلاقی برائیوں کو دبا کر رکھنے کی طاقت اس میں نہیں رہتی۔جب اس کے درمیان برے اور بے حیاء اور بد اخلاق لوگ اپنے نفس کی گندگیوں کو علانیہ اُچھالنے اور پھیلانے لگتے ہیں اور جب اچھے لوگ بے عملی (Passive Attitude) اختیار کر کے اپنی انفرادی اچھائی پر قانع اور اجتماعی برائیوں پر ساکت و صامت ہو جاتے ہیں تو مجموعی طور پر پوری سوسائٹی کی شامت آ جاتی ہے اور وہ فتنہ عام برپا ہوتا ہے جس میں چنے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشاء یہ ہے کہ رسول جس اصلاح وہدایت کے کام کیلئے اٹھا ہے اور تمہیں جس خدمت میں ہاتھ بٹانے کیلئے بلا رہا ہے اسی میں درحقیقت شخصی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے تمہارے لئے زندگی ہے اگر اس میں سچے دل سے مخلصانہ حصہ نہ لو گے اور ان برائیوں کو جو سوسائٹی میں پھیلی ہوئی ہیں برداشت کرتے رہو گے تو وہ فتنہ عام برپا ہوگا۔جس کی آفت سب کو لپیٹ میں لے لے گی۔خواہ بہت سے افراد تمہارے درمیان ایسے موجود ہوں جو عملاً برائی کرنے اور برائی پھیلانے کے ذمہ دار نہ ہوں بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں بھلائی ہی لیے ہوئے ہوں۔یہ وہ بات ہے جس کو سورہ اعراف آیت ۱۶۳۔۱۶۶ میں اصحاب السبت کی تاریخی مثال پیش کرتے ہوئے بیان کیا جا چکا ہے اور یہی وہ نقطۂ نظر ہے جسے اسلام کی اصلاحی جنگ کا بنیادی نظریہ کہا جا سکتا ہے''۔

قرآن کے ان ارشادات اور آیات کی توضیح وتشریح میں نبی ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کو بھی سامنے رکھا جائے تو مسئلہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ بزرگ و برتر چند خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو عذاب نہیں دیتا۔جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضی کرنے پر قادر ہوں۔اور پھر کوئی اظہار ناراضی نہ کریں،پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ خاص و عام سب ہی کو عذاب

میں مبتلا کر دیتا ہے''۔ (احمد طبرانی)

اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''خبردار! اللہ کی قسم یا تو تم ضرور معروف کا حکم دیتے رہو گے، منکر سے روکتے رہو گے۔ ظالم کا ہاتھ پکڑو گے اور اسے حق کی طرف موڑ دو گے اور اسے حق پر جما دو گے اور اگر تم ایسا نہ کرتے رہے تو تم سب کے دل ایک جیسے ہو جائیں گے اور پھر اللہ کی لعنت تم پر بھی ہو گی جس طرح یہود پر اس کی لعنت ہوئی۔'' (یعنی وہ تم کو اپنی رحمت اور ہدایت سے دور پھینک دے گا۔ جس طرح بنی اسرائیل کو اس نے دھتکار دیا)

دراصل مسئلہ کے دو پہلو ہیں، ایک دنیوی عذاب کا مسئلہ ہے اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آخرت میں ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو گا جہاں تک دنیوی عذاب کا تعلق ہے، حتمی بات یہی ہے کہ جب کسی بستی پر اللہ کا عذاب آتا ہے تو بستی کے سارے لوگ دو ہی گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک نجات پانے والا اور دوسرے خدا کی پکڑ اور عذاب میں مبتلا ہونے والا، یہی بات قرآن پاک سے بھی معلوم ہوتی ہے اور نبی ﷺ کے فرمودات سے بھی اور عقل کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے لیکن آخرت میں کیا فیصلہ ہو گا۔ اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی، بلاشبہ نہی عن المنکر کے فریضے سے غفلت ایک جرم اور کوتاہی ہے۔ لیکن اس غفلت اور کوتاہی کے ساتھ اللہ کیا معاملہ کرے گا، یہ اللہ ہی کو خوب معلوم ہے، وہ ایک ایک قول اور ایک ایک حرکت کا علم رکھتا ہے اور ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلہ فرمائے گا زندگی کے سارے اعمال خیر اور کوتاہی کو سامنے رکھ کر عدل و انصاف کا حق پوری طرح ادا کرتے ہوئے جو جس انجام کا مستحق ہو گا۔ اس کیلئے اسی کا فیصلہ فرمائے گا۔ البتہ دنیوی عذاب کی حد تک بات صاف ہے کہ برائیوں پر رضامند رہنے والے اور برائیوں کے ماحول میں کسی ناگواری کے بغیر سکون کے ساتھ رہنے والے اس انجام سے نہ بچ سکیں گے جس سے ماحول کے برے لوگوں کو سابقہ پیش آئے گا۔ اس حقیقت کو نبی ﷺ نے ایک نہایت ہی موثر اور بلیغ تمثیل کے ذریعے ذہن نشین کرایا ہے۔

''حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے حدود پر قائم رہنے والے اور اس میں کوتاہی کرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگوں نے کشتی میں

سوار ہونے کیلئے قرعہ اندازی کی جس کے نتیجے میں بعض بالائی حصے میں اور بعض لوگ نچلے حصے میں سوار ہو گئے تو جو لوگ نچلے حصے میں تھے، انہیں جب پانی کی ضرورت ہوتی تو اوپر والے لوگوں کی طرف سے گزرتے ،لہذا نیچے والوں نے سوچا کہ اگر ہم اپنے حصے میں ایک سوراخ کر لیں تو اوپر والوں کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں رہے گی، پس اگر اوپر والے نیچے والوں کو اپنا ارادہ روبعمل لانے کیلئے چھوڑ دیں تو تمام ہلاک ہو جائیں اور (اس کے برعکس) اگر وہ نیچے والوں کا ہاتھ پکڑ لیں (یعنی انہیں اس کام سے روک دیں) تو تمام کے تمام بچ جائیں ۔(بخاری)

دراصل اُمت مسلمہ شہادت علی الناس کے اعلیٰ منصب پر فائز کی گئی ہے اور اسے قیادت و امامت کا اُونچا مرتبہ عطا کیا گیا ہے، نیچے کی منزل پر رہنے والے سارے انسانوں کی نگرانی ان کو انصاف پر قائم رکھنے، خطرات سے بچانے اور صحیح حدود پر قائم رکھتے ہوئے راہ حیات کو طے کرانے اور بحرحیات کی کشتی پار لگانے کی ذمہ داری اسی کے سر ہے ۔قرآن کا ارشاد ہے:۔

''اسی طرح ہم نے تم کو اُمت وسط بنایا ہے تا کہ لوگوں پر دین حق کے گواہ بنو''۔

قرآن پاک کے اس فقرے کی تشریح میں جو نوٹ سپرد قلم کیا گیا ہے ۔وہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت بصیرت افروز اور موثر ہے ۔یہ نوٹ ہم ذیل میں نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں ۔

''آخرت میں جب پوری نوع انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا۔اس وقت رسول ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکر صحیح اور عمل صالح اور نظام عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی، وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا، اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اُٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسول ﷺ نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انہیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسول ﷺ نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انہیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی''۔

اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی

درحقیقت اس کی امامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسول اللہؐ اس اُمت کیلئے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے، اسی طرح اس اُمت کو بھی تمام دنیا کیلئے زندہ شہادت بننا چاہیے حتیٰ کہ اس کے قول وعمل اور برتاؤ، ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے۔راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔پھر اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کیلئے رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری بڑی سخت تھی۔حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے۔اسی طرح دنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت، جو تیرے رسول کے ذریعے سے ہمیں پہنچی تھی۔تیرے بندوں تک پہنچا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔تو ہم بہت بری طرح پکڑے جائیں گے اور یہی امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا۔ہماری امامت کے دور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین پر برپا ہوئے ہیں، ان سب کیلئے ائمہ شر اور شیاطین انس و جن کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا تم تم کہاں مر گئے تھے؟

آخر میں ایک حدیث پاک بھی ملاحظہ کرلیں "حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیلؑ کو حکم دیا کہ فلاں شہر کو، جہاں کے حالات اس اس طرح کے ہیں، ان کے باشندوں سمیت اُلٹ دو۔حضرت جبرائیلؑ نے عرض کیا "میرے پروردگار! اس شہر میں تیرا وہ فلاں بندہ بھی ہے جس نے ایک لمحہ کیلئے بھی تیری نافرمانی نہیں کی ہے۔آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اس شہر کو سارے باشندوں پر بھی اور اس شخص پر بھی اُلٹ دو۔کیونکہ میری خوشنودی اور میرے دین کی محبت میں اس شخص کے چہرے کا رنگ (شہر والوں کی نافرمانیوں کو دیکھ کر) ایک لمحہ کیلئے بھی متغیر نہ ہوا۔(مشکوۃ باب امر بالمعروف)

رحمت اللعالمین ﷺ

(عبدالرشید ساہی)

کافی دنوں سے سوچ بچار کر رہا تھا کہ اس مرتبہ شمارہ فلاح آدمیت کیلئے کون سا مضمون لکھا جائے تو ایک خواب میں رات کو میاں محمد صاحب کا کلام پڑھ رہا تھا آخری شعر تھا۔

دلبر دے گھر بے پرواہی کرے غریب نوازی
جس پر پاوے نظر محمد ﷺ جت جاوے او بازی

جب میں خواب سے بیدار ہوا تو ارادہ کر لیا کہ اس مرتبہ نبی رحمت ﷺ پر مضمون لکھوں گا ایک عظیم صوفی واصف علی واصف فرماتے ہیں "چونکہ آپؐ رحمت اللعالمین ہیں اسی لئے محبوبؐ رب العالمین ہیں" شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"۔

آپ ﷺ کے متعلق قرآن پاک میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں ترجمہ "بے شک آپؐ اخلاق کے بلندترین مرتبہ پر فائز ہیں" قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے ترجمہ "بے شک آپ کو سارے جہانوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے"۔ شاعر فرماتا ہے۔

صاحب خلق عظیم و صاحب لطف عمیم
صاحب حق، صاحب شق القمر ، خیر البشرؐ
کارزار دہر میں وجہ ظفر، وجہ سکوں
عرصہ محشر میں وجہ درگذر، خیر البشرؐ

آپؐ کی اتباع میں ہی دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کا راز مضمر ہے عرب جن کے پاس آپؐ کے آنے سے پہلے نہ رہنے کا مکان تھے اور نہ کھانے کیلئے وافر کھانا تھا لیکن وہ جب آپؐ کے دامن سے وابستہ ہوئے تو آدھی دنیا کے مالک بن گئے اور قیصر و کسریٰ کے خزانے ان کے قدموں میں آ گئے اللہ کی عبادت اور مخلوق کی خدمت سے ان کی زندگیوں میں سکون آ گیا پریشانیاں اور فکریں ختم ہو گئیں بقول ماہر القادری

جس نے بخشے زندگی کو حوصلے اور ولولے
وہ نظر صلی علیٰ، ٹوٹے ہوئے دل جڑ گئے

موجودہ دور میں علم کی فراوانی ہے جگہ جگہ مدرسے اور مساجد آباد ہیں جہاں سے ہر گھڑی اور ہر وقت اللہ اور رسولؐ اللہ کے ذکر کے ترانے گونجتے رہتے ہیں دورہ قرآن اور ذکر احادیث کی محافل بجتی رہتی ہیں گیارویں شریف کے ختم پاک اور عید میلاد النبیؐ کی تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں لیکن ہماری اصلاح ہوتی نظر نہیں آتی سارے کا سارا دین تو انسان کی اصلاح اور کردار کو سنوارنے کیلئے ہے ساری عبادتیں انسانی وقار کی تربیت کیلئے ہیں ہر سال کعبۃ اللہ کا حج مسلمانوں کو اتحاد ملی کا درس دینے کیلئے آتا ہے لیکن نہ تو امت مسلمہ میں اتحاد کی فضا پیدا ہو رہی ہے نہ کوئی کردار نظر آتا ہے بس یہ خالی خالی عبادتیں ہی عبادتیں نظر آ رہی ہیں کون سی برائی ہے جو ہم میں نہیں ہے یہ کیوں ہے؟ عزیز بھائیو۔ آج کل محرم شریف کے دن ہیں مجالس عزا عام ہو رہی ہیں شہدائے کرب و بلا کی داستانیں خوب مزے لے لے کر اور بڑے دردناک انداز میں بیان ہو رہی ہیں مگر عمل ندار۔

میرے ایک دوست اہل تشیع ہیں ان سے ذکر ہوا تو وہ فرمانے لگے بڑے دُکھ کی بات ہے کہ ہمارے اہل تشیع میں ایک گروہ ایسا ہے جو کہ حضرت علیؓ مرتضےٰ شیر خدا کے علاوہ باقی خلیفہ راشدین کو برا بھلا کہتے ہیں جو کہ نہایت غلط بات ہے ماتم کرتے ہیں جو کہ ہمیں زیب نہیں دیتا صرف اور صرف اہل بیت کی محبت دل میں ہونی چاہے یہ سن کر میں نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق تو وہ مسلمان مسلمان ہی نہیں جس کے دل میں اہل بیت کی عقیدت اور محبت نہ ہو دراصل بعض علماء حضرات نے روٹی کا پھندا لگایا ہوا ہے وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ ان کی بے سروپا باتوں اور مسائل سے اُمت مسلماں کا بہت نقصان ہو رہا ہے، خون خرابہ ہو رہا ہے فرقہ بندی کی وجہ سے فسادات بہت بڑھ گئے ہیں علامہ فرماتے ہیں۔

ملاں کم نظر نے اُمت میں پھوٹ ڈالی
تسبیح مصطفےٰؐ ہے صدیوں سے دانہ دانہ

اقبال مدرسوں نے دانش تو عام کر دی
کمیاب ہو گیا ہے جذب قلندرانہ

کردار کی اصلاح کیلئے کاوش ہونی چاہئے، انسانیت کی عظمت کیلئے کام ہونا چاہیے، مخلوقِ خدا کی فلاح کیلئے کوشش ہونی چاہیئے اُمت مسلمہ کی سربلندی اور وقار کیلئے سوچنا اور عمل کرنا چاہئے۔ آیئے قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کریں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں، ترجمہ" اے لوگو ڈرو اللہ سے اور سچی اور سیدھی بات کرو اس کے صلہ میں تمہارے سارے نیک اعمال اپنی بارگاہ میں قبول فرمالیں گے اور گناہ معاف فرمادیں گے" مقام غور و فکر ہے اللہ کے ساتھ انسان کا Agreement ہورہا ہے اور اس میں سچائی شرط ہے اور وہ ہم میں سرے سے نہیں بات بات میں جھوٹ بولنا ہماری عادت ہو چکی ہے اور فطرت بن چکی ہے اسی وجہ سے ہماری بدحالی اور بتاہی ہورہی ہے عشق مصطفیؐ کے دعوے تو بڑے ہوتے ہیں مگر سارے زبانی جمع خرچ لیکن جو انسان حقیقی معنوں میں عشق رحمت عالمؐ میں اپنے آپ کو غرق کر لیتا ہے وہ یہ جہاں چیز ہے کیا؟ لوح و قلم پر اس کی دسترس ہو جاتی ہے کیونکہ دیدار الٰہی کی منزل نقش کف پائے رسول پر چلنے سے حاصل ہوتی ہے علامہ فرماتے ہیں۔

کھولی ہیں شوق دید نے آنکھیں تیری اگر
ہر راہ گذر پہ نقشِ کف پائے یار دیکھ

وہی راہ منزل پہ لے کر جاتی ہے وہی راہ اللہ کا دیدار کراتی ہے وہی راہ کامیابی کی راہ، عظمت والی راہ، محبت والی راہ، شفقت والی راہ، حقیقت سے آشنائی والی راہ، جس نے بھی جو پایا ہے اسؐ در ہی سے پایا ہے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو احسن تقویم بنایا خلق کے بلندترین مقام پر فائز فرمایا۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ ، ید بیضاداری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

میاں محمد آف کھڑی شریف فرماتے ہیں۔

حسن بازار تیرے سے یوسف بردے ہووکاندے

ذوالقرنین ، سلیمان جہے خدمتگار کہاندے

نبیؐ رحمت کی اختیار کردہ راہ ہی فنافی اللہ کی منزل تک جاتی ہے آپؐ نے فرمایا ''نماز مومن کی معراج ہے'' حضرت امی عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ''جب آپؐ کے کان میں اذان کی آواز آجاتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے آپؐ کا ہمارے ساتھ کوئی رشتہ ہی نہیں ہے'' قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''انسان کی شدید ترین محبت اللہ سے ہونی چاہیے'' نبی رحمت فرماتے ہیں ''دنیا تمہارے لئے، عقبیٰ تمہارے لئے اور میرے لئے میرا اللہ کافی ہے'' حضرت بوعلی قلندرؒ فرماتے ہیں ''تو دنیا کو بھی چاہتا ہے اور اللہ کو بھی یہ محض خیال اور پاگل پن ہے'' حضرت شیخ فریدؒ فرماتے ہیں ''دنیا ایک پوشیدہ آگ ہے جس میں محبوب حقیقی کے عاشقوں کے سوا سب جل رہا ہے'' حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں ''جو شخص دنیا مردار کی محبت میں غرق ہو جائے وہ دیدار الٰہی کا طلب گار کیسے ہو سکتا ہے پس تو اپنے دل سے غیر اللہ کا ہر نقش مٹا دے'' حدیث قدسی میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں ترجمہ ''جو مجھے تلاش کرتا ہے یا مجھے طلب کرتا ہے بے شک وہ مجھے پالیتا ہے جو مجھے پالیتا ہے وہ مجھے پہچان لیتا ہے جو مجھے پہچان لیتا ہے اسے مجھ سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ میرا عاشق بن جاتا ہے جو مجھ سے عشق کرتا ہے میں اسے قتل کر دیتا ہوں اور پھر مجھ پر اس کی دیت لازم ہو جاتی ہے۔''

جو انسان اپنے آپ کو سرور عالمؐ کے رنگ میں رنگ لیتا ہے خدائی قوتیں اس کے ہم رکاب ہو جاتی ہیں اتباع رسولؐ کی بدولت ہی تو ابوبکر صدیقؓ بن گیا عمر بن خطابؓ فاروقؓ بن گیا عثمان بن عفان غنیؓ بن گیا اور علیؓ شیر خداؓ اور حیدر کرارؓ بن گیا محبت رسولؐ اختیار کرنے والا صحبت رسولؐ میں بیٹھنے والا ہر انسان اپنے اپنے کمال کو پہنچ گیا نگاہ نبوتؐ سے فیض یاب ہونے والا ہر انسان اپنے رب کا مقرب بن گیا۔ کیا نظر تھی؟ جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا۔ جب تک مسلمانوں نے اپنے پیارے رسولؐ رحمت عالمؐ کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا ان کے مقدر کا ستارہ جام ثریا پر چمکتا رہا اسلامی سالاروں کا نام سن کر صلیبی جرنیلوں کے ہوش اڑ جاتے تھے اور پتے پانی ہو

جاتے تھے علامہ اقبال اس منظر کی عطاسی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ دور کا مسلمان فرنگی کا غلام بن کر زندگی بسر کر رہا ہے غیر مسلموں کے ٹکڑوں پہ پل رہا ہے یورپی یونین سے خیرات لے کر کھا رہا ہے اس سے بڑی ستم ظریفی کیا ہوگی کہ ایک غیر مسلم ملک انڈیا نے ملک کو ایٹمی پاور بنانے والے سائنسدان عبدالکلام کو اپنے ملک کا صدر بنا دیا اور ایک مسلمان ملک کے نا عاقبت اندیش حکمران نے صرف اور صرف اپنے آقا امریکہ کو خوش کرنے کیلئے اپنے ملک کے محسن اعظم اپنے ملک کے مایہ ناز سائنسدان ڈاکٹر قدیر کو ملکی دفاع کو نا قابل تسخیر اور ملک کو ایٹمی پاور بنا دینے کی پاداش میں نظر بندی کی سزا دے دی اور اسلام کے نام پر بننے والے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو امریکی کالونی بنا دیا یہاں کے حکمران تو دیسی ہیں لیکن قانون ولایتی چلتا ہے دیکھنے کو ہمارا ملک آزاد ہے لیکن اس کو کمان وائٹ ہاؤس سے کیا جا رہا ہے اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ اب تو فرنگی آقا کے فرمان کے مطابق پاکستانی آرمی اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا خون بہا رہی ہے اور اپنی مملکت کے علاقہ جات کو فتح کرنے میں مصروف ہے غیر مسلموں کے حکم پر رحمت عالم ﷺ کے پروانوں کو دہشت گرد کا نام دے دے کر شہید کیا جا رہا ہے اسی ملک پاکستان کے علاقہ جات درّہ آدم خیل اور سوات کے علاقے قیامت صغریٰ کا منظر پیش کر رہا ہے مسلمان ہی مسلمان کا گھر جلا رہے ہیں اور ایک دوسرے کا گلہ کاٹ رہے ہیں۔

اے چشم اشک بار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر تو جل رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

شادی کی اہمیت

(امتیاز احمد)

آج ہم سب یہاں ڈاکٹر ظہور اور اسماء رضوی کی شادی کی دعوت ولیمہ میں شرکت کیلئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ میں ان دونوں کو نہ صرف اپنی، بلکہ یہاں موجود تمام مسلمانوں، سب دوستوں اور رشتہ داروں اور دیگر مذاہب کے مدعو حضرات کی طرف سے شادی کی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اسلام ہمیں شادی کے پر مسرت موقع پر خوشیاں منانے کی پوری پوری اجازت دیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی نہ صرف یہ کہ نئے شادی شدہ جوڑے کو بلکہ ان کو بھی جن کی شادیاں ہو چکی ہیں اور خاص کر ان کو جن کی شادیاں آئندہ ہونے والی ہیں، شادی کی اہمیت اور اس کی ذمہ داریوں کی طرف پوری پوری رہنمائی کرتا ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شادی ایک انتہائی اہم اور مقدس فریضہ ہے۔ اور پر سکون ازدواجی زندگی اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں ازدواجی زندگی کی سب سے زیادہ تفصیل دی گئی ہے۔

ایک کامیاب شادی وہی ہے جو اسلام کے بتائے ہوئے اصول و ضوابط کی بنیاد پر کی گئی ہو۔ اس سے نہ صرف یہ کہ گھریلو زندگی کامیاب ہوتی ہے، بلکہ اس سے ایک بہتر معاشرے کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ سب سے پہلے ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، جس نے شادی کے ذریعہ ہم سب کو کامیاب زندگی بسر کرنے کا صاف ستھرا، پاکیزہ اور فائدہ مند نسخہ عطا فرمایا۔ سورۃ النساء 28

وخلق الانسان ضعیفاo

(ترجمہ) انسان (طبعًا) کمزور پیدا ہوا ہے۔

اگر ہمیں تمام عمر بغیر شادی کے زندگی گذارنے کو کہا جائے تو ہمارے لئے بہت ساری مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے نکاح کا قانون بنایا ہے۔ تاکہ ہم ہر لحاظ سے شادی کے قابل ہوتے ہی نکاح کر لیں۔ شادی بہت ساری انسانی کمزوریوں کو مٹاتی ہے۔ شادی دو انجانے انسانوں یعنی مرد اور عورت کے درمیان ہمدردی، محبت، اخلاص اور دو اجنبی خاندانوں

کے درمیان اٹوٹ رشتوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔(سورۃ الروم: 21)

ومن ایتہ ان خلق لکم من انفسکم ازوجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ان فی ذلک لا یت لقوم یتفکرونO(21)

(ترجمہ)اور اُسکی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں، تا کہ تم ان سے آرام پاؤ۔اُس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کر دی۔ یقیناً غور کرنے والوں کیلئے اُس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

لہٰذا اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ مرد اور عورت کے درمیان شادی کے ذریعہ محبت، خلوص اور امن وامان کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے۔

دونوں میاں بیوی کے آپس میں محبت، خلوص، ایثار وقربانی کا جذبہ یک طرفہ نہیں ہے۔ بلکہ اس رشتہ کو آپس میں قائم و دائم رکھنے کیلئے برابر کے حصہ دار ہیں۔

قرآنِ پاک کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو الفاظ ایک ساتھ استعمال کئے ہیں۔(۱) موڈت(۲) رحمت۔ علماءِ دین کا کہنا ہے کہ دونوں الفاظ کا مطلب محبت ہے۔ موڈت وہ محبت و کشش ہے جو میاں بیوی کے درمیان فطری طور پر جوانی میں ہوتی ہے اس کے برعکس بڑھاپے میں جب یہ جذبات ختم ہو جاتے ہیں تو میاں بیوی اللہ کی رحمت سے سرشار ہو کر ایک دوسرے سے نہایت محبت اور عزت واحترام سے پیش آتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے چھوٹی سے آیت کریمہ کتنی فصیح وبلیغ ہے۔

اب میں میاں بیوی کے باہمی حقوق پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔ ہم سب کو دو طرح کے حقوق حاصل ہیں۔ ایک حق تجارت اور لین دین کے سلسلہ میں دیا گیا ہے۔ ان حقوق کی وضاحت تجارت کے معاہدوں میں درج ہوتی ہے اور تجارت کے متعلق فیصلے بھی اسی معاہدے کی روشنی میں ہوتے ہیں۔ اگر اس سلسلہ میں کوئی تنازعہ ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ قاضی کی عدالت میں ہوتا ہے۔

پھر دوسرے حقوق وہ ہیں جو والدین اور اولا داور دیگر رشتے داروں کے درمیان ہوتے ہیں یا

شوہر اور بیوی کے درمیان ہوتے ہیں۔دنیا میں آج تک کوئی ایسا آلہ یا پیمانہ ایجاد نہیں ہوا جو یہ بتا سکے کہ کس کیلئے کس کے دل و دماغ میں کتنی محبت یا کتنا خلوص یا کتنی ہمدردی ہونا چاہیے؟ سوائے اس کے کہ انسان کے دل میں اللہ کا ڈر اور خوف ہو اور روزِ آخرت میں جواب دینے کا احساس ہو تب وہ اس حق کو پورا پورا ادا کر دے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ اکثر فرمایا کرتے تھے **اتقوا اللہ** ۔یعنی لوگو زندگی کے ہر شعبے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔اس کی وضاحت کےطور پر آپؐ خطبہ نکاح میں سورۃ النساء کی پہلی آیت تلاوت فرمایا کرتے تھے جو کہ درج ذیل ہے۔

یایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس وحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء واتقوا اللّٰہ الذی تساء لون بہ والارحام ان اللّٰہ کان علیکم رقیباo (1)

(ترجمہ) لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا (یعنی اول) اور پیدا کیا اسی میں سے جوڑا پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد و عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دئے۔اور خدا سے جس کے نام کو اپنی حاجت روائی کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو اور (قطع مودت) ارحام سے (بچو) کچھ شک نہیں کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔

سوال:۔ہم اللہ تعالیٰ سے کیوں ڈریں؟

جواب:۔چونکہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور ہمارا وجود اس کی ذات پاک کا مرہونِ منت ہے ۔(سورۃ الانسان:1)

ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکوراo

(ترجمہ) بے شک انسان پر زمانے میں ایک وقت ایسا بھی آ چکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل ذکر نہ تھی۔

اگر اللہ چاہتا تو ہمیں کئی مختلف طریقوں سے پیدا فرما سکتا تھا۔لیکن اُس نے ہمیں ایک انسان آدم علیہ السلام سے پیدا فرمایا۔تاکہ ہم یہ یاد رکھیں کہ ہم سبھی انسان ایک ہی خاندان کے

افراد ہیں۔اسی لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس عظیم الشان خاندان کے ہر فرد کے درمیان محبت، اخوت، بھائی چارہ اور ہمدردی کے جذبات جاری وساری ہوں۔عالم انسانیت کو اس طرح کا سبق صرف اور صرف مذہب اسلام دیتا ہے!

اب میں شوہر اور بیوی کے درمیان تعلقات اور ذمہ داریوں کا ذکر قرآن حکیم اور احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں کرنا چاہوں گا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔(سورۃ النساء:34)

الرجال قومون علی النساء o

(ترجمہ)مرد عورتوں کے انچارج ہیں۔

اس آیت کا لوگ غلط مطلب اخذ کرتے ہیں اس لئے لوگ اس مضمون کے متعلق قرآنِ حکیم کی دوسری آیات کو بھول جاتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مرد عورت سے ظالموں اور جابروں جیسا سلوک کرے۔(سورۃ النساء:19)

وعاشرو ھن بالمعروفo

(ترجمہ)اپنی عورتوں کے ساتھ مہربانی اور محبت سے پیش آ ؤ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔سورۃ البقرہ:233

عن تراض منھما و تشاورo

(ترجمہ)خانگی معاملات میں اپنی بیویوں سے صلاح ومشورہ ضرور کرتے رہا کرو۔

اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے۔سورۃ البقرہ:228

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروفo

(ترجمہ)اور عورتوں کا حق (مردوں پر) ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کی نظر میں دونوں کے حقوق برابر ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ نے ہی دونوں کو مختلف ذمہ داریاں دی ہیں۔جو ذمہ داری مرد کو دی گئی ہے، وہ صرف مرد ہی بخوبی ادا کرسکتا ہے اور جو ذمہ داری عورت کو دی گئی ہے، وہ صرف عورت ہی بخوبی ادا کرسکتی ہے۔

پس ہر شوہر کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور اُس سے ہر بات میں مشورہ کرلیا کرے۔ پھر اس کی روشنی میں فیصلہ صادر کرے اور اگر مرد کا فیصلہ غلط ثابت ہو تو اُس کے نقصان کا پورا پورا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ اور اس کیلئے اُسے دنیا اور آخرت دنوں میں جواب دینا ہوگا۔ پس انچارج یا حکم ہونا مرد کیلئے ایک کٹھن امتحان ہے۔

ابھی تک میں نے صرف مردوں کو ہی نصیحت کی ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کیا عورتوں کے لئے کوئی حکم یا نصیحت نہیں ہے؟ ہے کیوں نہیں!

سوال:۔ اچھی اور نیک عورت کون ہے:۔

جواب:۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ سورۃ النساء 34۔

فالصلحت قنتت حفظت للغیب بما حفظ اللہo

(ترجمہ) تو جو نیک بیبیاں ہیں وہ مردوں کے حکم پر چلتی ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے خدا کی حفاظت میں (خاوند کی دولت و آبرو کی) پاسبان ہوتی ہیں۔

دولت سے مراد صرف مال و اسباب ہی نہیں بلکہ اولاد کی پرورش بھی ہے۔ لہٰذا اسلامی طریقہ پر اولاد کی پرورش بہت ہی اہم ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو عورتیں مال و اسباب کی حفاظت کے علاوہ پوری ایمانداری سے اپنی اولاد کی پرورش و نگہداشت کریں گی، اللہ تعالیٰ خود اُن عورتوں کی ہر ممکن امداد فرمائے گا۔

اس آیت کریمہ کی وضاحت میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا "بیویوں میں سب سے اچھی بیوی وہ ہے جسے دیکھتے ہی تمہارے دل میں خوشی کا احساس جاگے۔ جب تم اس سے کسی کام کا کہوں تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرے، اور جب تم اس سے دور رہو تو وہ تمہاری غیر موجودگی میں اپنے آپ کو اور اپنے مال و اسباب کو حفاظت میں رکھے"۔ (بخاری)

زندگی میں ہمیشہ ہی کامیابی، کامرانی، خوشیاں اور آسانیاں میسر نہیں ہوا کرتیں۔ کبھی کبھی اُونچ نیچ کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ سورۃ التغابن:14۔

وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان اللہ غفور رحیمo

(ترجمہ) اور اگر تم معاف کرو اور درگزر سے کام لو اور بخش دو تو بلا شبہ اللہ بہت معاف کرنے والا ہے۔

معاف کر دینے کی صورت میں آپ کی ہار نہیں بلکہ ایک طرح سے آپ کی جیت ہوتی ہے! لہٰذا اپنے باہمی اختلافات دور کرتے وقت میاں بیوی دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ صلہ رحمی سے پیش آنا چاہئے۔ ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا، کوسنا، جلی کٹی باتیں کرنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک اور بھی برا ہے۔ لہٰذا اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''اپنے والدین کو گالی مت دیا کرو''۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا؟ یا رسول اللہ کوئی اپنے والدین کو گالی کیسے دے سکتا ہے''؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جب تم دوسروں کے والدین کو گالی دو گے دوسرے بھی طبعاً تمہارے والدین کو گالی دیں گے۔ اس طرح تم اپنے ہی والدین کو گالیاں دلوانے کا ذریعہ بن جاؤ گے''۔ اس لئے اللہ تعالیٰ قرآن حکیم کے ذریعہ نہ صرف ہمیں ایک دوسرے کو معاف کرنے کی ہدایت فرماتا ہے بلکہ ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ ہم غصہ کی حالت میں اپنے گذشتہ اچھے تعلقات کو فراموش نہ کریں۔

سورۃ البقرہ: 237 میں ارشاد ہوا ہے

ولا تنسوا الفضل بینکمo

(ترجمہ) اور آپس میں بھلائی کرنے کو فراموش نہ کرنا۔

اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے درمیان باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ: 187۔

ھن لباس لکم وانتم لباس لھنo

(ترجمہ) وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم اُن کی پوشاک ہو۔

میں آپ سب سے ایک سوال کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ لباس کا مقصد کیا ہے؟ لباس ہمیں گرمی، سردی، دھول اور مٹی سے محفوظ رکھتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح میاں بیوی بھی ایک دوسرے کے محافظ ہیں۔ ایک دوسرے کی ڈھال ہیں۔ جس طرح لباس کسی حد تک ہماری جسمانی بدصورتی اور ظاہری عیوب کو چھپاتا ہے۔ بالکل اسی طرح میاں بیوی کو ایک دوسرے کی جسمانی اور اخلاقی

خامیوں اور کمزوریوں کو دوسروں سے چھپانا چاہیے۔

لباس مردانہ اور زنانہ حسن و خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ ملکر رہیں تو ایک جوڑے کی حیثیت سے ایک دوسرے میں نکھار پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ علاوہ ازیں لباس پہننے والے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ پس میاں بیوی کو صرف شادی بیاہ کی تقریبات میں حصہ لیتے وقت پر کشش لباس زیب تن نہیں کرنا چاہیے بلکہ شوہر اور بیوی کو ہر وقت بھی ایک دوسرے کیلئے زیادہ پر کشش بنے رہنے کی پوری پوری کوشش کرنا چاہئے۔ مثال کے طور پر ہر مرد کو گھر میں اور گھر کے باہر بھی بھدے اور بے جوڑ کپڑے نہیں پہننا چاہئے۔ یہی مثال عورت پر بھی صادق آتی ہے۔ اس لئے دونوں میاں بیوی کو اچھے سے اچھا لباس زیب تن کر کے ایک دوسرے کیلئے خلوص اور محبت کا اظہار کرنا چاہئے۔ یاد رہے کہ لباس صرف ظاہری حسن میں ہی اضافہ نہیں کرتا بلکہ اس سے دونوں کے حسن اخلاق کا بھی مظہر ہوتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لباس مرد اور عورت دونوں کے جسم کے قریب ترین چیز ہے۔ یہ جسم سے چپکا ہوا رہتا ہے، لپٹا ہوا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح شوہر اور بیوی کو بھی ایک دوسرے سے ایسے ہی قریب رہنا چاہئے۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ شوہر صرف اپنے رشتہ داروں کے ساتھ مل جل کر رہے اور بیوی صرف اپنے رشتہ داروں کے ساتھ میل جول بڑھائے۔ سب سے زیادہ قربت میاں بیوی میں ہونی چاہئے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے پوشیدہ رازوں سے بھی پوری طرح واقف رہتے ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کے راز فاش نہیں کرنے چاہئیں۔

دنیا بھر کی کسی بھی زبان کی کسی بھی کتاب میں اس اہم موضوع پر اتنا مختصر اور پر معنی جملہ نہیں ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں موجود ہے۔

ھن لباس لکم وانتم لباس لھن٥

(ترجمہ) وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم اُن کی پوشاک ہو۔

میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آیت مبارکہ کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

میں آخر میں ایک بار پھر شادی شدہ جوڑے کو دِلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

گلہائے عقیدت

درمدح حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ دام برکاتہم، بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ

(غلام ربانی صدیقی)

توحیدیوں کی رُوحِ رواں جان آرزو
پائی تیری نظر سے غلاموں نے آبرو

برسوں کو کشاں کشاں لئے پھرتی تھی کو بہ کو
اِک نازنین عرش معلیٰ کی جستجو

اب آ گیا ہوں در پہ لئے دل میں آرزو
ہو جائے آج چاک گریباں مرا رفو

اے زندہ دارِ محفل وحدت سلام ہو
مسکین و بے نوا سے کبھی ہمکلام ہو

دورِ طویل شام غریباں تمام ہو
ساقی مجھے بھی اب تو عطا ایک جام ہو

صہبائے معرفت سے بھرا ہے تیرا سبو
محفل میں اِک فقیر کی رکھ لے تو آبرو

وہ غالب و حکیم تو عبدالحکیم ہے
نازاں ترے دُروس پہ عقل سلیم ہے

تعلیم کیا ہے ، تحفہ خلق عظیم ہے
عشق خدا ہے حب رسول کریم ہے

جب طالبانِ حق سے تو ہو محو گفتگو
ہوتا ہے ذِکر عالم بالا میں سو بہ سو

تیرے غلام رہتے ہیں دن رات باوضو
جاری دل و زباں پہ ہے اللہ تو ہی تو

صورت جو دیکھئے تو فرشتوں سے خوبرو
سیرت نیاز و خلق سے معمور نیک خو

یہ طالب و مرید ہیں جن کا ہے پیر تو
تیرا پتہ نہ دے سکیں اہل مقام ھو

ہو جائیں جو بھی تیری غلامی میں شاد کام
ہو کر غلام ان کا ہے اُونچا بڑا مقام

دونوں جہاں میں ہو گئے خوش بخت نیک نام
برسا کیے ہے اُن پہ سدا رحمت تمام

گر گر کے آستاں پہ جو ہوتے ہیں سرخرو
ان کی نظر میں ہیچ ہے دُنیائے رنگ و بو

خواجہ میرا شفیق بڑا دِل نواز ہے
دردِ شکستِ دل کا وہی چارہ ساز ہے

میں کیا کروں نہ دم ہے، صدا ہے نہ ساز ہے
کوتاہ زندگی کی شب غم دراز ہے

للہ اب نظر ہو اے منظور وحدہ
در پر پڑا فقیر ہے کشکول در گلو

جس میکدہ میں جام نہ خالی کبھی رہے
پھر کیوں کسی کو شکوۂ تشنہ لبی رہے

دل کی لگی ، لگی ہے تو یا رب لگی رہے
یہ دِل لگی نہیں ہے۔ لگی ہے۔ جلی رہے

اس آگ میں بہارِ گلستانِ مُشک بُو
جلتے ہیں اِس میں طالب و مطلوب دُو بدُو

اے قبلہ اَم نگاہِ کرم کا سوال ہے
ساکت ترا غلام ہے، کیوں خستہ حال ہے

للہ اب نظر ہو اے منظورِ وحدہ
ہو جائے آج چاکِ گریباں مرا رفُو

توحیدیوں کی رُوحِ رواں جانِ آرزو
پائی تیری نظر سے گداؤں نے آبرو

نکل کر خانقاهوں سے ادا کر رسم شبیری

(اوریا مقبول جان)

ایسا ہی ایک دربار تھا۔اسی طرح کی فردواحد کی حکومت تھی جوانکار کرتا اسے عتاب اور ظلم کا نشانہ بنایا جاتا اس پرعرصہ حیات تنگ کردیا جاتا ۔بادشاہ کےنزدیک دین کی اپنی ایک توجیہہ تھی۔ بڑے بڑے علماءمحدثین اور صاحبان فکرکوایسے ہی چپ کرادیا جاتا تھا کہ میں بھی مسلمان ہوں۔تم سے زیادہ مجھے عزت وتکریم حاصل ہے میں حرم میں داخل ہوتا ہوں تو سارے دروازے کھل جاتے ہیں میں اپنے جدامجد کے بھتیجے سیدالانبیاء کے دربار پرتزک واحتشام سے بلایا جاتا ہوں میں اوران کی نسل وخانوادہ ایک ہیں۔تم میں کوئی عجمی ہےتو کوئی عام ساعربی ۔اس دور میں ان فقہیوں،محدثوں اور علماء نے دین میں ایک لفظ پر بہت زوردیا اوروہ تھا ''رخصت''یعنی جب حالات اجازت نہ دیں کہ دین کی کسی نس پر قائم رہاجائےتوباقی دین قائم رکھنے کے لئے اقرار کرکےچھوٹ لی جائےتوباقی دین قائم رکھنے کے لئے اقرارکرکےچھوٹ لے لی جائے۔اسی دور میں جب علماء کی زبانیں گنگ تھیں اللہ نے ایک شخص کودین کی ایک صفت ''عزیمت'' کی توفیق عطا فرمائی۔ان کی مشکیں اس زور سے کس دی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا جس پرستر کوڑون کی ضربیں لگائی گئیں۔چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں کوڑے اتنے شدید تھے کہ دو ضربیں لگا کر جلاد پیچھے ہٹ جاتا اور نیا تازہ دم جلاد آتا ۔اس حالت میں کہا گیا کہ بغیر کسی مدد کے اونٹ پرسوار ہوں تاکہ طرطوس کےقیدخانے لے جایا جائے۔

قیدخانے میں علماء کی ایک جماعت ملنے گئی اورحدیث سنا کرجان کے خوف میں چپ رہنے کی اجازت بتائی توفوراً سوال کیا کہ تمہارااس حدیث کی جانب کیاخیال ہے کہ جب صحابہ نے مظالم کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایاتم سے پہلے ایسے لوگ بھی تھے جن کےسروں پر آرا چلایا جاتا تھااورجسم لکڑی کی طرح چیر دیا جاتا تھالیکن وہ حق سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔یہ سب علماء دربار میں موجود تھے جب کوڑے لگانے کا حکم صادر ہواچند نے کہا تمہارے ساتھیوں نے تو ایسی ہٹ

دھری نہیں دکھائی۔آپ کا جواب تھا مجھے اس کا جواز اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت سے نکال دو۔جسم خون سے رنگین ہوگیا۔رمضان کا مہینہ تھا۔ہوش آنے پر پانی لایا گیا تو کہا میں روزے سے ہوں،وہاں سے نکلے تو ابن سماعہ کی امامت نماز ادا کی،نماز
کے بعد امام نے سوال کیا خون جاری ہے طہارت کہاں سے آئی۔جواب دیا جب حضرت عمرؓ نماز پڑھا رہے تھے تو قاتل نے حملہ کیا مگر خون کے ساتھ نماز کی امامت کی۔سوال کرنے والے کو اندازہ ہی نہیں تھا اس سے مقدس خون اور کیا ہوسکتا ہے۔

ایک اور بادشاہ تھا روشن خیال،اپنا دین وضع کرنے والا،اس کی ہندو عورت سے شادی کے نتیجے میں ایک بیٹا پیدا ہوا۔عاشق مزاج،اٹھارہ بیویوں کا شوہر،انارکلی کا سلیم اور عرف عام میں جہانگیر۔اس کے دربار میں بھی فقیہان کرام اور علمائے کرام اوقاف کے تنخواہ داروں کی طرح موجود تھے۔پورے ملک میں صاحبان طریقت بھی تھے۔خود دہلی میں خواجہ باقی باللہ تھے کہ صوفیاء میں عظیم مرتبہ رکھتے تھے۔کسی نے سوال کیا تو جواب میں کہا میں تو چقماق کا پتھر ہوں۔آگ لگا دوں گا،چراغ تو شیخ احمد سرہندی ہے جسے لوگ مجدد الف ثانیؒ کہتے ہیں۔ہاں عزیمت کا حوصلہ اور توفیق تو انہیں ہی حاصل ہوئی۔وہی تھے کہ جنہیں گوالیار کے قلعے کی قید و بند بھی متزلزل نہ کرسکی۔جن کی گردن جہانگیر کے سامنے نہ جھک سکی۔کون کون موجود نہ تھا،شیخ وجیہہ گجراتی،شیخ علی متقی،شیخ جلال تھانیسری،ملا محمد جونپوری،مولانا یعقوب کشمیری،ملا عبدالحکیم سیالکوٹی،لیکن خانقاہ سے نکل کر رسم شبیری ادا کرنے کی توفیق اس صاحب عزیمت شیخ احمد سرہندیؒ کے حصے میں آئی۔

اسلام کی تاریخ سیدنا امام حسینؓ سے لیکر آج تک رخصت اور عزیمت کے کرداروں سے بھری پڑی ہے اور تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ اس نے زندہ صرف اس کا نام رکھا،اس کے کام کو پذیرائی دی،اسی کو عزت و تکریم سے نوازا جو عزیمت کے علمبردار تھے۔ورنہ اس دور کے علماء کے نام گرد آلود تذکروں میں ڈھونڈ کر نکالنے سے بھی مشکل سے ملتے ہیں۔یہی لوگ تھے جن کو مسندوں پر بیٹھے علماء اور خانقاہوں میں بیٹھے صوفیا نے عزت دی،دعاؤں کیلئے ہاتھ اٹھائے اور

جہاں ممکن ہوا ساتھ دیا۔

رخصت اور عزیمت کا یہ باب مجھے اس وقت بہت یاد آتا ہے جب میں لاکھوں کے مجمعے کو مسواکیں تیز کرتے، عمامے اور شلواریں درست کرتے جوق در جوق سجدہ ریز ہو کر دعائیں کرتے دیکھتا ہوں۔ یہ لوگ خواص کو اپنے درمیان پا کر بہت خوش ہوتے ہیں اسے اپنی نصرت قرار دیتے ہیں۔ مجھے یہ سب اس وقت بھی یاد آتا ہے جب رنگ برنگے قمقموں، سجی سجائی معطر محفلوں اور خوش الحان نعت خوانوں کی لے پر سر دھنتے، نوٹوں کی بارش کرتے لاکھوں کے ہجوم کو دیکھتا ہوں۔ مجھے یہ صاحبان عزیمت اس لمحے میں بہت یاد آتے ہیں جب سرکاری سطح پر کوئی علماء و مشائخ کی کانفرنس منعقد ہوتی ہے۔ یہ تاریخ ساز لوگ اس موقع پر بھی شدت سے یاد آئے جب لاکھوں کا دھکے کھاتا ہجوم امام کعبہ کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھا۔

احمد بن حنبل اکثر کہا کرتے تھے کہ خدا ابن الہثیم پر رحم کرے۔ بیٹے نے پوچھا کون ہے یہ شخص۔ کہا جب مجھ پر کوڑے برسائے جا رہے تھے تو یہ شخص عین بازار میں میرے قریب آتا۔ کہاں میں ابن الہثیم ہوں۔ اس بغداد کا سب سے بڑا چور، اسی بار گرفتار ہوا۔ اتنے کوڑے لگے کہ کوئی جسم کا حصہ زخم سے خالی نہیں لیکن جب چھوٹا سیدھا چوری کرنے نکلا۔ دیکھو میں چوری میں اتنا ثابت قدم ہوں کہیں کل اللہ تم سے یہ سوال نہ کرے تم میری راہ میں ایک چور ابن الہثیم سے بھی کم ثابت قدم تھے۔

کیا یہ سوال میرے آج کے علماء، فقہا، صوفیا اور خانقاہ نشینوں سے نہیں پوچھا جائے گا، کیا آج کا دور معتصم باللہ اور اکبر و جہانگیر سے زیادہ معزز و محترم ہو گیا ہے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر لاکھوں کے مجمعے، ہجوم اور لوگوں سے بھرے پنڈال کے سامنے آ کر اگر کوئی ابن الہثیم کھڑا ہو گیا اور کہا میں بد معاش ہوں، قاتل ہوں، چور ہوں، لیکن ثابت قوم ہوں۔ مطلق العنان بادشاہ کی نہیں مانتا تو کتنے اس مجمعے میں اٹھ کر کہیں گے کہ ہم تم سے زیادہ ثابت قدم بننا چاہتے ہیں ہم اللہ کے حضور شرمندگی سے بچنا چاہتے ہیں۔ (بشکریہ روزنامہ ایکسپریس)

انسانی مسئلہ

(علامہ عنایت اللہ خاں المشرقیؒ)

صحیفہ کائنات پریشان ذہنی یا حسن اتفاق کی پیداوار نہیں

12۔مندرجہ بالا دعاوی ہرگز قابل تسلیم نہیں ہو سکتے کیونکہ (ا) کوئی وجہ نہیں کہ صرف انسان کے بارے میں اس کی فطرت کے خلاف نوعی جدوجہد اس منزل پر آ کر ختم ہو جائے حالانکہ ادنیٰ حیوانات کے بارے میں یہ جدوجہد لکھوکھا برس سے چلی آئی ہے اور ختم نہیں ہوئی (اگرچہ ان پر یہ جدوجہد طرزِ عمل وسعت اور نوعیت کے اعتبار سے مختصر ہی رہی ہے)، (۲) ان دعاوی سے یہ گمان لازم ہو جاتا ہے کہ باقی تمام کائنات بے مقصد ہی ہے۔انسان سوائے اس کے کہ قدرت نے اُسے محض حسن اتفاق سے پیدا کر دیا کسی مزید امکانی طاقتوں کا حامل نہیں، بلکہ یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ کائنات میں وہ عظیم ترین شعور بھی موجود نہیں جسنے اپنی کمال تجویز و تدبیر سے باشعور انسان کو لا کھڑا کیا، (۳) یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ انسان کی اپنی ہی نوع کے خلاف کشمکش غیر فطری ہے، (۴) ان دعاوی کی بنا پر انسان اپنی تقدیر کا مالک آپ بن جاتا ہے (۵) صحیفۂ فطرت بھی محض افراتفری کی پیداوار بن جاتی ہے اور یہ وہ موقف ہے جس سے انسانی عقل باغی ہے، (۶) یہ ناممکن ہے کہ انسان قدرت کے مقابلے میں اپنی اُن ہیچ میرز صلاحیتوں کے بل بوتے پر جو اُسے فی الحال میسر ہیں اپنی تقدیر کا مالک آپ بن جائے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں انسان بلکہ سائنسدان کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کر رہی ہیں

۱۳۔عالمی جنگیں آہستہ آہستہ انسان کو واحد عالمی حکومت کے تخیل کی طرف مائل کر رہی ہیں اگرچہ ہو سکتا ہے کہ اس تجویز میں بھی انسان کے خلاف بدنیتی اُن سیاستدانوں کے دماغ میں موجود ہو جو اس کے علمبردار ہیں۔اُدھر ''جمہوریت'' اور ''اشتراکیت'' دونوں انسان کو اپنی طرف کھینچ لینے کی خاطر بڑھ بڑھ کر قدم مار رہی ہیں تا کہ زمینی وسائل معاش کو کلیتہً اپنے تصرف میں لا کر دنیا کی کمزور بے قیمت اور ''فالتو'' آبادی کو تباہ کر دیں یا اپنا غلام بنالیں۔ہر دو فریق اپنی سیاسی

طاقت سائنسدان سے حاصل کرتے ہیں جوان کا تنخواہ دار نوکر ہو کر انسان کو ہلاک کرنے کے آلات تیار کرنے میں لگا ہے اور اپنے دماغ میں قریباً مذہبی یقین لئے بیٹھا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے۔ وہ اپنی تجربہ گاہ میں اپنے آقاؤں کی نہایت چالاک اور ہشیار نشر و تبلیغ کے نامحسوس سحر کے زیر اثر سیاستدان کا عاجز اور ادنیٰ غلام بن کر کام کرتا ہے اور سیاستدان ایک نہایت حقیر معاوضہ اس کے گزران کیلئے دے کر اس کی ایجادوں کو ''بطور حق'' اس سے چھین لیتا ہے۔ اس طرح پر سائنسدان نہ صرف آج بلکہ صدیوں سے ایک گونگا اور بہرہ ''بے ملک نواب'' بنا بیٹھا ہے جس کا مرتبہ فی الحقیقت ایک مزدور سے بڑھ کر نہیں۔ اس طرح پر نام نہاد جمہوریت کی دونوں شکلیں انسان کو ایک برادری میں (حتیٰ کہ ادنیٰ حیوانات کی ابتدائی برادری میں بھی) داخل ہونے سے روکتی ہیں اور تسخیر کائنات جیسے رفیع الشان اور جان بخش نصب العین سے ہٹا کر صحیفۂ فطرت کے خلاف مجموعی نوعی جنگ کرنے نہیں دیتیں۔

سائنسی ایجادات نہ ہوں تو سرمایہ اور مزدور دونوں محض بیکار ہیں!

۱۴۔ حقائق کا گہرا مطالعہ ہر صاحب پر یہ نایاب اور آنکھوں سے اُوجھل رہی ہوئی سچائی کو عیاں کر دے گا کہ سرمایہ کی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں جب تک کہ سائنسدان کی ایجاد اُس سرمایہ کو استعمال میں لانے کیلئے موجود نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس ایک اور گہری سوچ ہمیں اتنے ہی چونکا دینے والے نتیجہ پر پہنچا دیتی ہے کہ مزدور کے بازو قطعاً بیکار ہیں اگر سائنسدان اس کو اپنی ایجاد کے بنانے کا طریقہ بتانے سے انکار کر دے۔ الغرض دماغ ہی بالآخر وہ شے ہے جو انسان کے بازوؤں اور سرمایہ کو حرکت دیتا ہے۔ سائنسدان نے کئی صدیوں سے اس بات کو محسوس نہیں کیا کہ دنیا جہاں میں سب حرکت اُسی کے دم سے ہے، صفحۂ زمین پر تمام ترقی (ہر امکانی لحاظ سے) اُسی کے دماغ کی بدولت ہے۔ قرنوں کی غلامی نے اُسے ایک نوکر اور مزدور کی حیثیت دے دی ہے اور کور مغز سیاستدانوں کے بغلول اپنی جہالت اور ظالمانہ فطرت کے باوجود زمین کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ ان جہالت کے مجسموں کو کیا معلوم کہ آج انسانیت کی ترقی کا رخانہ فطرت کے اصلی حیاتیاتی مقصد سے کس قدر رو در ہٹ کر ہو رہی ہے۔

سائنسدان بدرجہ اُولیٰ اس کا مستحق ہے کا انسانیت کی رہنمائی کرے!

سائنسدان پر لازم ہے کہ اُس انتہائی علم وخبر کی بنا پر جو اُسے صحیفۂ فطرت کے متعلق میسر ہے، وہ بنی نوع انسان کی رہنمائی اُس مقصد کی طرف کرے جس کی خاطر صحیفہ کائنات کو پیدا کیا گیا اور نسل انسانی کو سرمایہ داروں اور رنگیلے بے فکروں کے رحم وکرم پر نہ چھوڑے، یہ تصور کہ انسان کی تقدیر ایسے ہاتھ میں جو کارخانہ فطرت کی ''مشیت'' اور ''مقصد'' سے قطعاً ناآشنا ہیں، طبیعت میں بغاوت اور نفرت پیدا کرتا ہے اور انسان کی کورمغزی کی روشن مثال ہے۔

سائنس تمام سچائی کا منبع ہے:۔

۱۵۔صرف سائنسدان ہی باقی تمام انسانوں سے زیادہ شعور کا مالک ہے اور صحیفہ فطرت کے متعلق اس کے ناطق فیصلوں بلکہ بالعموم اس کے مروجہ نظریوں کو بھی انسان نے سچائیاں سمجھ کر بلاحیل وحجت قبول کیا ہے روئے زمین پر تمام قوت آسودگی اور خوبصورتی اسی سائنسدان نے پیدا کی ہے۔اگر سائنسدان نہ ہوتا تو دنیا اندھیر ہوتی۔اُس کا (آنکھ، کان اور ذہن کا) علم ہی دنیا میں واحد حقیقت ہے۔وہی ایک وجود ہے جو فطرت کے غلاف سے پردوں کے پردے ہٹا کر عیاں کر رہا ہے کہ قدرت کے معمہ عظیم کے نیچے کیا عالم آرا خوبصورتی اور سچائی ہے۔اس بنا پر وہی اس کا واحد حقدار ہے کہ انسانیت کی رہنمائی کرے۔نہیں بلکہ زمین پر اپنی حکومت، اپنے پیدا کئے ہوئے نظم ونسق اور کمال حکمت عملی سے بنی نوع انسان کو اس کی آخری تقدیر تک پہنچا دے۔کورمغز اور وحشی سیاستدان جس نے روزِ اول سے انسانیت کو مذہب، نسل، رنگ وغیرہ کی بنا پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے قیامت بپا کر رکھی ہے، سائنسدان آخری شخص ہے جس کو انسانی ارتقا کا مقدس اور متبرک فرض سونپا جا سکتا ہے۔

صرف سائنسدان ہی انسان کے تمام اختلافات کو مٹا سکتا ہے

۱۶۔سائنسدان بنی نوع انسان کو صرف صحیفۂ فطرت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، مذہب یا نسل، ذات یا رنگ، جغرافیائی حدود یا تاریخی روایات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔وہ انسانوں کے کسی فرقہ، یا، مذہب سے واسطہ نہیں رکھتا اور نہ وہ عقیدوں، سیاسی حیلوں یا تعصبوں کی رو میں بہہ جاتا

ہے۔اس پر وحی کا نزول براہ راست صحیفۂ فطرت سے ہوتا ہے جو بہر نوع واحد حقیقت ہے اور بہر صورت برحق ہے۔اس کی ایجادات تمامتر انسانیت کے فائدے کیلئے ہوتی ہیں اور اُن کا عوام کی ملکیت بن جانا اُسے ناگوار نہیں گزرتا۔وہی واضح دلائل اس امر کے پیش کر سکتا ہے کہ انسان کی مجموعی سرگرمیاں کن خطوط پر ہونی چاہئیں، بحیثیت مجموعی اس کا قدرتی طرزِ عمل برخلاف اُن تمام طریقہ ہائے عمل کے کیا ہو جن پر دنیا کے "سیاستدان" اپنے جذبوں کی بے ہوشی اور فطرت کے آخری مقصد کی نافہمی کے باعث دنیا کو لگاتے رہتے ہیں۔ادنیٰ حیوانات نے بالاتر مخلوقات کی طرف اپنا ارتقاء فطری تقاضا اور اُکساہٹ، انتخاب طبعی اور قدرت کے معمولات کی مکمل پیروی کے باعث کیا ہے لیکن انسان صاحب اختیار و شعور ہونے کی بدقسمتی کے باعث اِن محرکات کی پیروی نہیں کرتا۔وہ صحیح یا غلط اپنی راہ آپ بنانا چاہتا ہے جو اب تک افسوسناک طور پر غلط ہی رہی ہے۔اس بنا پر لازمی امر ہے کہ سائنسدان جو فطرت کا صحیح علم رکھنے کے بارے میں منفرد حیثیت رکھتا ہے انسان کیلئے اس کی صحیح راہ فطرت کی ضروریات کے مطابق متعین کرے۔

سائنسدان کی حکومت بنی نوع انسان کو ایک متحرک برادری بنادے گی:

سائنسدان اگر نسل انسانی کی سیاسی رہنمائی کیلئے تیار ہو گیا تو یقینی طور پر نسل، مذہب، ذات پات، رنگ وغیرہ کے تمام اختلافات کو مٹا دے گا، تمام دُنیا میں دولت کی مساوی تقسیم ضرور کر دے گا اور جہاں تک ممکن ہو سکا امیر اور غریب کی حیثیت کو برابر کر کے انسانی ذہن کو قوموں کی ایک برادری اور ایک اخوت کے ڈھانچے میں ڈھال کر رہے گا۔وہ سرمایہ اور مزدور کے پیدا کئے ہوئے تمام جھگڑوں کو یقیناً سیدھے طور پر دیکھے گا اور پھر ان جھگڑوں کو مناسب وزن اور اہمیت عالمی مسئلوں کی روشنی میں دے گا۔اس کے نزدیک امیر اور غریب کے تمام ناموزوں اختلافات اور انسان پر انسان کا ظلم ختم ہونا چاہیے اور انسانی جھگڑوں کو فطرت کے درشت فیصلوں کو پیش نظر رکھ کر دیکھا اور طے کیا جانا چاہئے۔سرمایہ اور مزدور دونوں چونکہ سائنسدان کی ذہانت، اس کی صحیفۂ فطرت میں اہمیت اور اُس کی بالاتر سوچ بچار کے مقابلے میں اس کے ماتحت ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس لئے سائنسدان ہی کا مقام ہے کہ وہ باقی تمام انسانوں سے بلندتر ہو کر

اس زمین پر بطور ان کے آقا اور قاضی اور رہنما بن کر رہے تمام سائنسدان چونکہ دنیا بھر میں ایک ہی سچائی کے حامل ہیں اس لئے لازماً لامحالہ ان کو سیاست کی اُس واحد سچائی کا اعلان بھی کرنا ہوگا جس کی بنیاد محض فطرت کی ناگزیر ضرورت پر ہو یا دوسرے لفظوں میں حکومت کی وہ ٹھوس تنظیم قائم کی جائے جو تمام نسل انسانی کو فطری خطوط پر اُس واحد مقصد کیلئے چلائے جس کا نتیجہ بنی نوع انسان کو تخلیق کی بالاتر صورتوں میں منتقل کرنا ہو۔

سرمایہ کی اُس طاقت کو جو برے نتائج پیدا کرتی ہے ختم کرنے کا طریقہ

۱۷۔سرمایہ کے تمام شرانگیز اثرات قلم کی ایک ادنیٰ جنبش سے ختم کئے جاسکتے ہیں وہ یہ کہ مساوی تعداد کے قرعہ اندازوں کے امیروں اور غریبوں کے کامل طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ انتخابی حلقے ہر ملک میں قائم کردئے جائیں اور غریب اکثریت کو امیر اقلیت سے قطعی طور پر علیحدہ کردیا جائے۔اس ترکیب سے مغربی طرز کی جمہوریت اپنی آجکل کی شیطانی سطح سے گر کر اصلی، علمی، منطقی اور انسانی سطح پر آجائے گی یعنی اُن لوگوں کی فی الواقع حکومت قائم ہوگی جو تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔سرمایہ پھر دُنیا میں اپنی مناسب جگہ پر آجائے گا یعنی پچانوے ۹۵ فیصدی سوچنے والوں، جاننے والوں، ایجاد کرنے والوں یا پسینہ خون اور آنسو بہانے والوں کے بالمقابل پانچ ۵ فیصدی سست الوجودوں کا گروہ ہوگا۔سرمایہ کے برے اثرات اس طرح پر رہائی پانے کے بعد اکثریت کی یہ برادری قدرتی طور پر سائنسدان کے گرد جمع ہو جائیگی جو تمام خوشحالی امن اور طاقت کا منبع اس دنیا میں ہے اور فطری طور پر غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔معمولی سا ہیر پھیر اس کو ہر جگہ انسانی معاملات کا سربراہ بنادے گا۔رُوئے زمین پر واحد عالمی حکومت پھر ممکنات میں آجائے گی جو تمام بنی نوع انسان کی رہنمائی ایک مقصد کی طرف کردے گی اور وہ مقصد بذاتِ خود فطرت کا مقصد ہوگا۔

سائنسدانوں کی حکومت کے ماتحت عالمی نظام حکومت

۱۸۔یہ انقلاب پیشتر اس کے کہ رونما ہو سرمایہ دار اور سیاستدانوں کے ہاتھوں دنیا میں ایک خوفناک ہیجان پیدا کردے گا مگر یہ ایک کڑی ذمہ داری ہے جسکا سائنسدان کو ہر قیمت پر مقابلہ کرنا

ہو گا۔سائنسدان کا یہ جذباتی عذر کہ وہ "سیاستدان" نہیں کچھ وزن نہیں رکھتا کیونکہ عنانِ حکومت اُس کے ہاتھ میں آنے پر دنیا کی سیاست میں بنیادی تبدیلیوں کا واقع ہونا لازمی ہے۔جو ایک ایسے نظام حکومت کو قائم کریں گی جو قطعی طور پر علمی، حرکت انگیز اور تعمیری ہو گا۔اس نظام کے اہم خدوخال حسب ذیل ہوں گے (۱) انسان کو "پیغمبر زدہ" مذاہب سے الگ کر کے اس کے رگ و ریشے میں اُس واحد دینِ فطرت کا تخیل کوٹ کوٹ کر بھرنا جو تمام موجودہ مذاہب عالم کی اصلی روح کے مطابق ہے اور علمی نقطہ نگاہ سے سب کو قابل قبول ہو گا۔(۲) انسان کو اس کے خود ساختہ تعصبات مثلاً رنگ و نسل وغیرہ سے نجات دلانا (۳) وسائل زمین سے مکمل استفادہ کی خاطر انسانی نگاہ کو فطرت کے متعلق وسیع کرنا اور اس مقصد کے حصول کیلئے انسانی ہاتھوں اور دماغوں کو یکجا کرنا، (۴) زمین کی آبادی کو بے پناہ طور پر گنجان کرنے کے وسائل پیدا کرنا تا کہ کشمکش حیات اپنی انتہا تک پہنچ سکے۔(۵) مسئلہ زندگی کے حل کو براہ راست ہاتھ میں لینا تا کہ انسان زندگی کو پیدا کرنے کے قابل خود اس لئے ہو جائے کہ فطرت کی چیستان کے اندر تک پہنچ سکے۔نیز اس لئے کہ اپنے شعور کی سطح کو بلند و بالا کر کے ارفع تر مخلوق کی طرف ارتقا کر سکے، (۶) اپنے انتہائی محدود اور ناقص علم کو جو اُسے اس وقت میسر ہے، جائزہ لے کر، آنکھ اور کان سے پیدا ہوئے ہوئے علم کو جدید تر وسائل دریافت اور فطری اشیاء کی نئی پیمائشی اکائیوں کی ایجاد سے وسیع کرنا تا کہ وہ موجودہ ناقص علم کی پیدا کی ہوئی گھومنے والی مشینوں، ٹیلیفون، دوربین ریڈیو، حسابی مساواتوں اور فارمولوں یا ہیڈروجن بم وغیرہ وغیرہ سے بہتر ایجادیں کر سکے، اور جس ناقص علم نے اب تک اُس کو وہ مطلق باخبری اور علی الاطلاق حاضر باشی کی خاصیتیں نہیں دیں جو اس کے تمام کائنات کے کوشے کوشے پر حاوی ہونے کیلئے لازمی ہیں۔(۷) اُن ذرائع کا اختیار کرنا جو انسان کی کشمکش حیات کو اُس عظیم الشان مجادلے اور محاربۂ عظمٰی کے مماثل کر دے جس کی شدت سے تمام نوع انسانی کے جسمانی اعضا سر بسر اُن جوارح میں مبدل ہو جائیں جو زمین سے پرے کے آسمانی کُروں پر انسانی قبضہ قائم کرنے کے موافق ہوں، یا دوسرے لفظوں میں انسانی جسم آسمانی کُروں پر آباد ہونے کے قابل ہو جائے۔

جب تک انسان کی تمام نوع کو اس کل زمینی مجادلے کیلئے تیار ہونے پر مجبور نہ کیا جائے تب تک کسی ایسے تقاضائے عام کا اُس انتہائی بڑے پیمانے پر نمایاں ہونا ناممکن ہے جو انسانی دماغ اور اس کے جسمانی اعضا کو ارفع واعلیٰ شکلوں میں تبدیل کر دے۔

انسان کے موجودہ علم میں بنیادی نقائص

۱۹۔ عالمی حکمرانوں کی اس کہکشانی مجلسکو اس زمین پر ہونے والے فوق البشروں کی ایک منظم آبادی تیار کرنے کے بعد جو فطرت کے خلاف ایک نہایت سرتوڑ اور خوفناک جنگ کر رہی ہو گی اور نہایت دہشت ناک مادی اور ذہنی ہتھیاروں سے مسلح ہو گی، سب سے پہلے انسان کے علم کے متعلق حسب ذیل بنیادی مسئلوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے:۔

اِنسان کی بنائی ہوئی جیومیٹری فطرت کی جیومیٹری نہیں!

(ا) سب سے پہلے یہ بات ایک بدیہی سچائی کے طور پر ماننی پڑے گی کہ انسان کا علم خواہ وہ کسی صورت میں ہو، اگر چہ اس کے براہِ راست مشاہدہ فطرت کا نتیجہ ہے لیکن اس کی گنتیاں اور پیمائشیں، اُس کے فارمولے اور مساواتیں، اس کی بنائی ہوئی ریاضی اور جیومیٹری، بلکہ دراصل جس طریقے سے بھی وہ بیجان مادّے کو استعمال کرتا یا اس کو استعمال میں لانے کی غرض سے اس میں رد و بدل کرتا ہے، وہ سب اس کی اپنی اختراعوں اور گنجائشوں کی پیداوار ہیں فطرت کو اُس کی ذہانت کی ان پیداواروں سے کوئی واسطہ نہیں، نہ فطرت اِن سے کچھ سیکھ سکتی ہے، نیز یہ بھی نہیں کہ فطرت کا علم وخبر اِن وسیلوں سے تیار کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے یہ واضح ہے کہ فطرت کو اپنا نقشہ مکمل کرنے کیلئے اُس کے پاس اپنی ''جیومیٹری'' اور ''ریاضی'' اپنے ''فارمولے'' اور ''مساواتیں'' لازمی طور پر ہونی چاہئیں۔ اس بنا پر لازم ہے کہ فطرت کی پیمائش کی اکائیاں اور گنتی کے طریقے انسان کے اِن خودساختہ اختراعوں سے بنیادی طور پر مختلف ہوں اور اس کے علاوہ وہ اکائیاں اور طریقے جامع تر صحیح تر اور مادے کی فطرت پر زیادہ منطبق ہونے والے چاہئیں۔ اگر انسان نے فطرت کی اشیاء سے کچھ چیز بنائی ہے تو لازمی ہے کہ فطرت نے اس کا پہلے ہی تخمینہ لگا لیا ہو، نہ یہ کہ یہ ایک محض حسن اتفاق تھا۔

انسان کا زندگی کے بارے میں علم انتہائی طور پر ناقص ہے!

اُدھر انسان زندگی کے بارے میں علم حاصل کرنے میں اب تک کوئی قابل ذکر طور پر کامیاب نہیں ہوا، نہ اب تک وہ زندگی کے متعلق اپنے مشاہدوں کو "فارمولوں" اور "مساواتوں" میں منتقل کر سکا ہے۔ برخلاف اس کے زندگی کے متعلق معلوم ہے کہ وہ محض حرکت سے شُدہ شُدہ بڑھتے ہوئے ہوش، بڑھے ہوئے ارادے اور بڑھتے ہوئے شعور کی طرف ترقی کرتی گئی ہے اور انسان اس ترقی کی وجہ بھی اب تک دریافت نہیں کر سکا، نہ اُس کی پیمائش کر سکا ہے جیسا کہ وہ بے جان اشیاء کے احوال یا دوسری خاصیتوں کے متعلق وجوہات دریافت کرتا ہے یا ان کی لمبائی، وزن، کثافت، حرارت، رفتار وغیرہ کی پیمائش کرتا ہے۔ وہ اس پر بھی علیٰ ہذا القیاس قادر نہیں ہوا کہ مختلف زندگیوں کو آپس میں "ملا" کر (یعنی پیوند لگا کر یا کسی اور طریقے سے) کوئی نئی شے پیدا کر سکے جیسا کہ وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کو آپس میں "ملا" کر نئی شے یعنی پانی پیدا کر دیتا ہے۔ اُس نے ابھی تک اس مسئلے کو بھی حل نہیں کیا کہ زندگی کی کتنی "کثافت" یا "شدت" ایک خاص قسم کا شعور پیدا کرتی ہے یا مثلاً قادر مطلق یا علم مطلق کے درجے تک پہنچنے کیلئے کس "مقدار کا شعور" درکار ہو گا۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ انسان نے کوئی پیمائش یا گنتی کی اکائیاں جاندار مادے کے متعلق ایجاد نہیں کیں۔ برخلاف اس کے فطرت کے پاس یہ اکائیاں لازماً موجود ہیں بلکہ لامحدود طور پر دریافتیں بھی اس کے پاس ہیں تا کہ فطرت اپنے نقشہ تخلیق کو مکمل کر سکے۔

زندگی بے جان مادّہ کے تسلسل ہی کی ایک کڑی ہے

اُدھر یہ بات لازمی ہے کہ بے جان مادہ ہی اپنے اندرونی "ارتقا" کی کسی منزل پر، یا اُس پر کسی "بیرونی حالات کے وارد ہو جانے سے ابتدائی زندگی میں یک لخت زمین پر بدل گیا ہو گا، لیکن انسان اب تک اس مظہر فطرت کو اپنی ریاضی کے قاعدوں یا پیمائش کی اکائیوں کے تابع نہیں کر سکا، نہ اب تک وہ اس عمل کو دریافت کر سکا ہے جس کی رو سے بیجان مادہ زندگی تک پہنچ سکتا ہے۔ (جاری)

قوم پرستی یا اسلام

(پروفیسر کریم بخش نظامانی)

انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) نے ''آزادی، مساوات اور بھائی چارہ'' کے خوشنما نعروں سے کچھ عرصے کے لئے پورے یورپ میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا اور لگتا تھا کہ یہ انقلاب نوع انسانی کے لئے ایک امید افزا صبح لے کر آیا ہے اور تو اور ڈس ورتھ ایسا ''شاعر فطرت'' بھی ان نعروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور انقلاب فرانس کے متعلق کہا:

ترجمہ: (اس سویرے میں (صرف) زندہ ہونا ہی ایک بڑی نعمت تھی۔ (اور) جوانی کی حالت میں ہونا تو جنت تھی) لیکن یہ انقلاب بھی بہت جلد آمریت اور قوم پرستی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ نپولین بونا پارٹ نے ۱۷۹۹ء میں ''ڈائریکٹری'' کا خاتمہ کیا اور مکمل ۱۵ سال (۱۷۹۹ء سے ۱۸۰۴ء) تک فرانس کا مطلق العنان حکمران بنا رہا۔ اس عرصہ میں نپولین ایک کٹر قوم پرست کے روپ میں ظاہر ہوا۔ اس نے جولائی ۱۸۰۹ء میں آسٹریا کو شکست دی اور جون ۱۸۱۲ء کو روس پر حملہ کیا۔ غرضیکہ انقلاب فرانس بھی صرف دس سال تک اپنی نیم مردہ روح کے ساتھ تاریخ کے اسٹیج پر تھرکتا رہا۔

قوم پرستی کا تصور: ۔ اپنے خاندان، اپنی برادری اور جائے پیدائش (گاؤں: قصبہ یا شہر) سے انسان کا لگاؤ ایک فطری امر ہے۔ اسلام ایسے لگاؤ اور ایسی محبت کا مخالف نہیں بلکہ قرآن پاک تو ہمیں صلہ رحمی (خون کے رشتہ دار سے اچھا سلوک کرنا) کی تاکید کرتا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ اپنے قبیلے بنوامیہ کے ساتھ بہت ہی اچھا برتاؤ فرماتے اور ان کے غریب اور نادار لوگوں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ یہی معاملہ جائے پیدائش کا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو شہر مکہ سے محبت تھی اور آپ سے اس کا اظہار بھی فرمایا ہے۔

مدینہ ہجرت کر آنے کے بعد آپ اس سے بھی محبت فرمانے لگے حتیٰ کہ مدینہ کے قریب واقع کوہ احد کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ ''اس کو ہم سے اور ہم کو اس سے محبت ہے'' **(او کما قال)**۔

علی ہذا القیاس زبان کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ انسان اپنی مادری زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان پر کیسا ہی عبور کیوں نہ رکھتا ہو، اس پر اظہار بیاں کی کیسی ہی قدرت کیوں نہ حاصل

کر لے لیکن یہ عبور اور یہ قدرت بیان مادری زبان پر اس کے عبور کے برابر نہیں ہوسکتی وہ اپنی مادری زبان کی شاعری سے ویسا لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔

میں غالب، اقبال اور شیکسپیئر کی شاعری مزے لے لے کر پڑھتا ہوں۔ ان کی شاعرانہ عظمت اور انداز بیاں سے کبھی کبھی مسحور بھی ہوجاتا ہوں۔ میں نے ان شعراء کے کلام کی تشریحات بھی پڑھی ہیں لیکن شاہ لطیف کے اشعار گنگنانے میں جو لطف آتا ہے وہ دوسری زبان کے کسی بھی شاعر کے کلام سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے کلام میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس کے لہجہ اور اس کے الفاظ کے صوتی آہنگ سے میرے کان بچپن ہی سے مانوس اور آشنا ہیں۔ اس کے برعکس شیکسپیئر کی جادو بیانی سے میں صرف لغت کی معرفت متعارف ہوا ہوں۔ گویا لغت میرے کانوں اور ذہن اور شیکسپیئر کے محور کن کلام کے درمیان ایک حجاب ہے۔

اس بات کا ایک مرتبہ ذاتی تجربہ بھی ہوا ہے۔ میں ۲۰ویں صدی کے بے مثال انگریزی شاعر ٹی ایس ایلیٹ کے کلام کو بہت پسند کرتا ہوں۔ لغت اور نقادوں کی تشریحات اور اساتذہ کی مدد سے ایلیٹ کی شاہکار نظمیں کئی مرتبہ پڑھیں۔ لیکن ایک مرتبہ جب بی بی سی سے ایلیٹ کی ایک نظم ان ہی کی زبان سے سنی تو مجھے احساس ہوا کہ اس نظم کا حقیقی حسن تو مجھے آج نظر آیا۔ اب تک تو صرف پرچھائیوں پر ہی لٹو تھا۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ درست لیکن اصل مہلک چیز قوم پرستی (Nationalism) کا وہ سیاسی تصور ہے جو مغرب سے ہمارے یہاں آیا ہے۔ جب تک مغربی اقوام کو مسلمانوں پر سیاسی غلبہ حاصل نہیں ہوا تھا اس وقت تک ''قوم پرستی'' بحیثیت ایک سیاسی نظریہ ہم میں رائج نہیں تھی۔ مسلمانوں کی آپس کی خانہ جنگیوں میں خاندانی چپقلش قبائلی عصبیت اور ایسے ہی کچھ عناصر کا دخل تو ہے۔ لیکن وہ ہمہ گیر قوم پرستی کم نظر آتی ہے جس نے مغرب سے مستعار لی ہوئی عرب قوم پرستی کے ذریعے سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ کردیا۔

اپنا اور پرایا:۔ فی زمانہ زبان، رنگ، نسل اور وطن ہی انسانوں کو جوڑنے اور ایک رکھنے والے بندھن تصور کیے جاتے ہیں کیونکہ مغرب کی سیکولر سیاست کی رو سے ''اپنا'' وہی ہے جو ہم زبان، ہم رنگ، ہم نسل اور ہم وطن ہو۔ باقی سب پرائے ہیں۔ قوم پرستی کا یہ تصور اسلام کی آفاقی (Univarsal) تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ یہاں انسانوں کو جوڑنے والے یہ محسوس اور مادی

بندھن نہیں ہیں ہمیں بلکہ وہ روحانی رشتے ہیں جو حب خدا اور حب رسول کے ذریعے اہل ایمان کو آپس میں جوڑتے ہیں ان کے لیے اللہ اور رسولؐ پر ایمان رکھنے والا "اپنا" ہے خواہ کوئی سی زبان بولتا یا کہیں کا بھی رہنے والا ہو۔ کلمہ طیبہ کی چاردیواری کے اندر آجانے والا اپنا اور اس سے باہر والا "پرایا" ہے خواہ سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔

نبی اکرم ﷺ نے ہجرت فرمانے کے بعد مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کے درمیان مواخات (بھائی چارہ) کا سسٹم قائم فرمایا۔ مہاجرین میں سے ایک شخص کو کسی انصار کا بھائی بنایا۔ اسی طرح تمام مہاجرین کسی نہ کسی انصار کے بھائی بن گئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے جو ایثار کیا اس کی مثال ملنا محال ہے۔

جنگ بدر کے موقع پر ایک طرف ایک ہزار مشرکین مکہ تھے۔ تو ان کے مقابلہ میں صرف ۳۱۳ مومنین تھے۔ اس جنگ میں باپ ایک طرف تو بیٹا دوسری طرف تھا۔ اس کی ہیئت ترکیبی پر ذرا غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ کس قدر ریختہ ہوتا ہے ایمان کا رشتہ!

عتبہ لشکر کفار کا ایک اہم سردار تھا تو ادھر اس کا بیٹا ابوحذیفہ بن عتبہ اسلامی لشکر میں تھا۔ عبدالرحمٰن بن ابوبکر مشرکوں کے لشکر میں تھا۔ اس نے جب مبارزت (Duell or Single combat) طلب کی تو اسلامی لشکر میں سے اس کی للکار کا جواب سب سے پہلے سیدنا ابوبکر ہی نے دیا۔ وہ اپنے بیٹے سے لڑنے کے لیے بڑھے بھی لیکن حضور پاک نے منع فرما دیا کہ رحمت اللعالمین کو یہ بات ناپسند تھی کہ باپ بیٹا ایک دوسرے کے خون سے اپنے ہاتھ رنگیں۔ اس جنگ میں حضور پاک کے داماد ابوالعاص اور چچا عباس (یہ دونوں حضرات بعد میں ایمان لائے) جنگی قیدی بنائے گئے اور حضور نے ان سے فدیہ وصول کیا اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ ان ہی واقعات کی وجہ سے یوم بدر (۱۷ رمضان المبارک) کو "یوم الفرقان" بھی فرمایا گیا ہے کہ اس دن اسلامی برادری یا ملت کی بنیادیں اور زیادہ مستحکم ہوگئیں۔

نظریاتی قومیت:۔ مادہ پرست اور سیکولر ذہن میں ان باتوں کا سمانا بہت ہی مشکل ہے۔ دراصل یہ ایک روحانی اور مابعد الطبیعیاتی بندھن ہے۔ دین اسلام، اللہ اور رسولؐ کی محبت اور اطاعت کے ذریعے انسانوں کو اپنی طرف کھینچ کر زمینی رشتوں سے بہت بلند اٹھا دیتا ہے۔ اس بلندی پر وہ جن تجربات سے گزرتے ہیں، انسانی زبانیں ان کو بیان نہیں کرسکتیں۔ روحانیت کی سطح مرتفع کے یہ مکین جب **اشداء علی الکفار** اور **رحماء بینھم** کا عملی مظاہرہ کرتے

ہیں، جیسا کہ خاصان بدر نے کیا تو زمین پر رینگنے والے مادہ پرست کیڑے ان مظاہروں کو محض ”افسانے“ سمجھتے ہیں۔

ترجمہ: محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں“۔ (سورۃ الفتح)

میں نے ”قومیت“ کا لفظ محض مفروضہ کے طور پر استعمال کیا ہے ورنہ قرآن پاک میں رسول اللہ ﷺ کو ماننے والوں کے لیے کہیں بھی ”قوم“ کا لفظ استعمال نہیں فرمایا گیا۔ اللہ کی اس کتاب میں عاد اور ثمود اور قوم نوح اور قوم موسیٰ و ہارون (یعنی بنی اسرائیل) کا ذکر تو ہے لیکن ”قوم محمد“ کا ذکر پورے قرآن میں نہیں ہے۔ حضور کے ماننے والوں کو ملت فرمایا گیا ہے۔

ترجمہ: قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ (سورۃ الحج، آخری آیت)

دراصل جن لوگوں کو مسلم (مسلمان) کہا جاتا ہے، ان کا یہ نام اللہ نے خود رکھا ہے۔ اپنے طور پر انہوں نے یہ نام اختیار نہیں کیا اور یہ گروہ مسلمین کوئی قوم نہیں، بلکہ ایک ملت ہے اور اس ملت کی نظریاتی بنیاد اللہ سے وابستگی پر رکھی گئی ہے۔

اس ملت کو ایک منصب پر بھی فائز کیا گیا ہے۔ قرآنی ارشاد کے مطابق وہ مذہب یہ ہے:

ترجمہ: اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

قوم اور ملت کا فرق: ۔ قوم اور ملت کی نہ صرف ہیئت ترکیبی میں فرق ہے، بلکہ ان کا مقصد وجود بھی الگ الگ ہے۔ قوم مبنی ہے زبان، نسل، رنگ، وطن وغیرہ کی بنیاد پر اور ملت وجود میں آتی ہے اللہ اور رسول پر ایمان کی (نظریاتی) بنیاد پر۔ قوم، مقامی اور ملت بین الاقوامی اور آفاقی ہوتی ہے۔ دنیا کے سیاسی نقشے میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ”قوم“ کے حدود اربعہ بھی بدلتے رہتے ہیں، جبکہ ملت کے ہاں سرے سے حدود اربعہ ہیں ہی نہیں۔ ”ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست“۔ نقل مکانی سے بھی قومیں بدلتی رہتی ہیں مثلاً اینگلو سیکسن نسل کے لوگوں کا ایک حصہ نقل مکانی کر کے امریکہ پہنچتا ہے تو اب یہ لوگ ”انگریز“ یا ”برطانوی“ کے بجائے امریکی کہلاتے ہیں۔ ”قوم کا مقصد وجود“ دوسری اقوام کے مقابلے میں اپنے اپنے قومی مفاد کا تحفظ ٹھہرتا ہے جبکہ

ملت (یا امت) کا مقصد وجود ہے "نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا"۔ "قوم" صرف اپنے افراد کی دنیوی اور مادی ترقی کے لیے کوشاں رہتی ہے جبکہ "امت" نوع انسانی کے خیر خواہ کے طور پر اس کے اپنے اخروی مفاد کی خاطر اسے نیکی کا حکم دیتی اور بدی اسے روکتی ہیں۔ "قوم" کی کوتاہ بینی صرف "قبر کی زندگی" کو دیکھ سکتی ہے، جبکہ ملت (اُمت) کی انتہائی دور رس نگاہیں اُفق کے اس پار تک جاتی ہیں۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

ان گذارشات سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کی دنیوی ضروریات سے اغماض برتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اسلام کا اپنا مکمل سماجی، سیاسی اور معاشی نظام موجود ہے لیکن یہ بات ہمارے موضوع سے باہر ہے۔

اسلام کا نظریہ انسان: ۔ قرآن کی رو سے انسان مختلف ارتقائی مراحل سے گزرنے والا کوئی جان دار نہیں ہے، جس کے کئی "والدین" ہوں اور جو کئی "حادثات" کے نتیجے میں دنیا کے مختلف جغرافیائی خطوں میں بس گیا ہو۔ بلکہ تمام انسانوں کی "اصل" ایک ہے اور اس کو ایک وقت مقررہ پر تخلیق کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ: اے انسانو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ (سورۃ النساء)

جب تمام انسانوں کی "اصل" ایک تو پھر یہ برتری کا احساس کیسا اور یہ خاندانی اور قومی غرور و تکبر کیوں؟ اس کی تو ایک ہی ضرب سے جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ جب اللہ فرماتا ہے کہ تمہاری پیدائش ایک ہی جان سے ہوئی ہے تو پھر یہ "سپر مین" اور "سپر قوم" کا تصور تم کہاں سے نکال کر لائے ہو؟

قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے روز جب انسان اپنے دنیوی اعمال کی جواب دہی کے لیے بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوگا تو اس سے اسلام کے سوا کچھ بھی قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ "اللہ کے نزدیک دین تو بس اسلام ہی ہے" (القرآن) اور یہ کہ قبر میں بھی اس سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم کون ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ صرف یہ پوچھا جائے گا کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا رسول کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ (ایک حدیث کا مفہوم) انسان کے دائمی مستقبل کا انحصار ان سوالات کے ٹھیک ٹھیک جوابات اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے پر ہے جب اصل معاملہ یہ ہے تو قرآن پاک کا مخاطب کوئی قبیلہ یا قوم یا کسی وطن کا باشندہ کیسے

ہوسکتا ہے؟وہ تمام انسانوں سے خطاب کرتا ہے۔یہ تو اہل مغرب کی بددیانتی ہے کہ اسلام کو عربوں کا مذہب بتاتے ہیں اور یہ بھی ان لوگوں کی کج فہمی ہے کہ اس دین حق کو ایک ''خاص دور'' کے لیے محدود کر دیتے ہیں۔اسلام تو قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے لیے آیا ہے لامحالہ وہ ''اے عربو یا اے عجمیو! کہ کر نہیں پکارتا بلکہ اسلام کی پکار یہی ہے کہ ''اے انسانو!...'' قرآن فرماتا ہے:

ترجمہ: اے انسانو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے۔تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہوسکتی ہے۔(البقرہ آیت ۲۱)

اس کے برعکس ایک قوم پرست صرف اپنے لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے ''اے جرمنو! اے فرانسیسیو! اے امریکیو! اے روسیو! اے مہاجرو! اے سندھیو!...'' یہ ایک بڑا فرق ہے اس لیے کہ قوم پرست، انسان دوست ہو ہی نہیں سکتا۔اس کا نعرہ تو یہی ہوتا ہے کہ ''میرا ملک... صحیح ہو یا غلط''۔

اس امت کو وطن پرستی کا سامنا سب سے پہلے اسود عنسی کی شکل میں کرنا پڑا، جس نے سب سے پہلے یمن میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔حضور ﷺ نے اپنے دور مبارک میں یمن کے ایک حصہ میں شہر بن بازان (ایرانی) کو اور دوسرے حصہ پر اپنے ایک صحابی کو عامل مقرر فرمایا تھا اسلام کا مقابلہ کرنے کے لیے اسود عنسی نے نعرہ لگایا تھا کہ ''حجازیو! یمن چھوڑ جاؤ! ایرانیو! یہاں سے نکل جاؤ! یمن یمنیوں کا ہے۔اس طرح مسیلمہ کذاب نے بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تو اس کے پیروکار کہتے تھے کہ قریش کے سچے نبی (محمد ﷺ) کے مقابلہ میں ہمارے لیے بنو حنفیہ (مسیلمہ کذاب کا قبیلہ) کا جھوٹا کذاب) قابل ترجیح ہے۔سیدنا ابو بکر کے دور میں ان دونوں کو شکست دی گئی۔حضرت ابو بکر نے اسود عنسی (جو کہ ایک عرب تھا) پر شہر بن بازان (ایک عجمی) کو ترجیح دی۔اس طرح مسیلمہ کذاب کا مقابلہ کرتے وقت اس بات کا لحاظ نہیں کیا گیا کہ وہ حجاز کا ہے۔دراصل ایک قوم پرست جھوٹے نبی کا پیروکار ہوتا ہے جبکہ ایک مومن سچے نبی محمد ﷺ کا امتی ہوتا ہے۔

آپس کی لڑائی:۔قرآن پاک فرماتا ہے: ترجمہ: اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ (سورۃ الحجرات)

انسانی دماغ میں تصور خدا کی دریافت

(ابوالامتیاز ع۔س۔)

غیر معمولی یادداشت ایک حیرت انگیز صلاحیت ہے جو بعض ذہنی پسماندہ بچوں میں پائی گئی ہے۔ناروے میں بعض ذہنی پسماندہ ''بچوں'' سے بیس برس بعد میری دوبارہ ملاقات میں نام اور قومیت کی اجنبیت کے باوجود انہیں اس ادھیڑ عمر میں بھی نہ صرف مجھے پہچاننے، بلکہ میرا نام یاد آنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

یہ خاصیت میرے زیر اہتمام قائم سائنو سامرکز تربیت برائے ذہنی پسماندگان (تاسیس 1962ء) کی بچی جمیلہ (اصلی نام نہیں) میں موجود تھی اس کا درجہ ذہنی پسماندگی شدید متعین کیا گیا لیکن یادداشت کا یہ عالم تھا کہ اپنی انگلش ریڈر کی نظم ونثر کے صفحات اسے طوطے کی طرح ازبر تھے۔تاہم حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ معمولی سے الفاظ، جیسے کیٹ CAT یا ریٹ RAT تک شناخت نہ کرسکتی تھی یہ لڑکی بھی مرگی زدہ نہ تھی۔

یادداشت کی یا دیگر معمولی صلاحیتیں عام افراد میں بھی پائی جاتی ہیں۔ہم سب کسی نہ کسی کی ایسی صلاحیت سے واقف ہیں جس میں اس نے کاغذ، پنسل یا مشینوں کے بغیر جمع، تفریق، ضرب، تقسیم، عاداعظم، ذواضعاف اقل وغیرہ اور ریاضی کے دیگر نہایت طویل پیچیدہ و دشوار مسائل سوال ختم ہونے سے پہلے ہی حل کردیئے۔جنوبی ہندوستان کی شکنتلا نامی ایک خاتون کو اللہ تعالی نے یہ صلاحیت بدرجہ کمال عطا فرمائی تھی اس نے دوبار اپنے پاکستان کے دوروں میں اپنے کمال کا مظاہرہ کیا۔1951-52ء کے لگ بھگ اس کے پہلے دورے میں تھیوسوفیکل ہال کراچی میں مجھے خود یہ عجوبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا بنکوں کے بڑے بڑے ماہرین رائج الوقت برقی مشینوں کے ساتھ سٹیج پر اس کے امتحان کے لئے موجود تھے۔وہ چاک ہاتھ میں لئے سوال ختم ہونے کے ساتھ ہی تختہ سیاہ پر جواب لکھنا شروع کردیتی اور مشینیں ابھی چرچرا رہی ہوتیں کہ وہ جواب مکمل کردیتی۔یہ خاتون نہ ذہنی پسماندہ تھی نہ مرگی زدہ اور نہ کسی علت میں مبتلا تھی۔

اسلامی تہذیب میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ آٹھ دس سالہ بچوں نے پورا قرآن کریم حفظ

کرلیایا14،15 سال کی عمر میں پیچیدہ دینی نصاب ختم کر کے فارغ التحصیل ہوگئے۔مغربی ممالک میں بھی دس بارہ سالہ بچوں کے دقیق علمی کورس ختم کر کے یونیورسٹیوں میں داخلے کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔کینیا میں 5 سالہ شریف رعد نامی یتیم اور نا خواندہ بچے کو پانچ زبانوں پر عبور حاصل ہے۔اس کا کہنا ہے کہ وہ لوگوں کی باتیں سن کر ہی ان کی زبان سیکھ لیتا ہے۔وہ ایک کیتھولک خاندان میں پیدا ہوا۔چار ماہ کی عمر میں اس کے پہلے الفاظ عربی میں یہ تھے ''تم لوگ توبہ کرلو اللہ تعالیٰ (1۔یہ واقعہ مصنف سے مظہر یوسف صاحب نے 10 فروری 2000ء کو بیان کیا، جب میں نے جی اے مجددی صاحب کے نام کی تصدیق کے لئے ان سے رابطہ کیا) قبول کرلے گا'' اس کے والدین سمجھے وہ آسیب زدہ ہے۔تاہم جب پڑوسی مسلمانوں نے بچے کے اجنبی خطاب سے اس کے والدین کو آگاہ کیا تو انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔خبر کے مطابق ایک ہزار افراد مسلمان ہوئے۔یہ بچہ نہ آسیب زدہ ہے نہ مرگی زدہ (1)

امریکہ میں جسٹن چیپ مین (JUSTINCHAPMAN) نامی بچے نے دو سال کی عمر میں جبکہ بچے بمشکل چند لفظ بول سکتے ہیں پڑھنا شروع کردیا اور اب (فروری 2000ء) چھ سال کی عمر میں کالج کے تین نصابوں میں بیک وقت داخلہ لے لیا ہے۔راچسٹر یونیورسٹی۔(UNIVERSITY OF ROCHESTER) میں اس کا موضوع کورس ''عالم قدیم'' ہے۔اس سے قبل وہ طویل یونانی رزمیہ نظم (EPIC) ''الیاڈ'' (ILLIAD) نیز بابلی دیومالا (BABYLONIAANMYTHOLOGY) پر مقالات تحریر کرچکا ہے۔وہ بڑا ہوکر دماغی جراح (BRAIN SURGEON) بننا چاہتا ہے (اور وہ مرگی زدہ نہیں ہے۔) (2)

ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے بھی بہ اذن اللہ مہد میں کلام کیا۔ان سے زیادہ ذہنی و روحانی صحت کا مالک ان کے دور میں کون تھا!

ڈاکٹر خالد جمیل اختر ایم بی بی ایس ماشاءاللہ جوان ہیں لاہور میں طب کرتے ہیں اور ٹیلی ویژن پر ''بڑے بھائی'' یا BIG BROTHER کے نام سے ذہنی وجسمانی معذوروں کیلئے اکثر پروگرام کرتے رہتے ہیں۔دوران تعلیم ایک حادثے میں ان کی بہت سے اعضا شکستہ ہوگئے

اورانہیں ''صحت مند'' ہونے میں طویل عرصہ لگا۔اس کے باوجود وہ صرف اس قابل ہوئے کہ بیساکھیوں پر چل پھر سکیں ۔وہ پسرِ ممتاز مسلم کے دوست ہیں ۔ایک دفعہ ''مسلم ولا'' میں دوران قیام شب کو جب متعدد دوست گپ شپ کے لئے مجلس جمائے بیٹھے تھے وہ پانی یا کسی دوسری ضروریات کے لئے حسب عادت بیساکھیوں کے سہارے تنہا باورچی خانے کی طرف چلے گئے۔ جہاں انہیں کوئی ایسی عجیب وغریب وہیبت ناک ہیئت نظر آئی کہ وہ خوف ودہشت سے چلانے اوراچھلنے کودنے لگے، بیساکھیاں نیچے گر گئیں دوست احباب چیخ وپکار سن کر بھاگتے ہوئے آئے انہیں سوائے کے کچھ نظر نہ آیا کہ خالد جمیل کی حالت غیر ہے،وہ اچھل کودرہا ہے اور بیساکھیاں نیچے گری پڑی ہیں ۔وہ آخری دن تھا کہ خالد جمیل نے بیساکھیاں استعمال کیں،اوران غالباً بیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہو چلا ہے وہ ان کی مدد سے چلتے پھرتے ہیں ۔ہر چند کہ انکا جسمانی نقص چلنے پھرنے میں واضح ہے ۔ڈاکٹر خالد جمیل مرگی کے مریض نہیں ہیں ۔(3)

تسخیر کائنات :۔ ایسی اور بھی خرق عادات صلاحیتیں یا مظاہر بچوں اور بڑوں سے سامنے آتے رہتے ہیں ۔انکی تحقیق وتدقیق اور تفتیش وجستجو نہ صرف وظیفہ علمی ہے بلکہ فریضہ عبدیت بھی۔ اللہ تعالٰی نے تمام کائنات اوراس کی موجودات انسان کے لئے مسخر کردیں ۔اور بمطابق آیت کریمہ **وعلم آدم الاسماء کلھا** (2۔البقرہ۔31)''ہم نے آدمؑ کو تمام اشیاء(کائنات) کے نام (انکی معرفت) کا علم دے دیا''اور یہ تسخیر زمین وآسمان اوران کے درمیان کی ہر شے کو بلاتخصیص وتحدید محیط ہے ۔مزید براں اس عطائے شرف کی خبر درجنوں بار دی گئی ہے، تا کہ بنی نوع انسان علم وتحقیق کی اس نعمت سے بہرآن اور بہر طور متمتع ہو ۔اب لازم ہے کہ اس علم کی روشنی میں مزید تلاش اسرار ورموز فطرت ہو،لیکن ایسی صلاحیتوں کو جسمانی علتوں سے تعبیر کر کے مرض کی علامت قرار دینا خود نہ صرف علامت مرض ہے بلکہ کفران نعمت بھی۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب کوئی صلاحیت یا حس ضائع ہوجاتی ہے تو اکثر اوقات اس کے نعم البدل کے طور پر کوئی دوسری صلاحیت معمول سے بہت زیادہ بیدار ہو جاتی ہے ۔اس میں شک نہیں کہ اس کا امکان فطرت انسانی میں طبعی طور پر ودیعت ہوتا ہے،لیکن یہ عمل رحمت ربانی سے ہی ظہور پذیر ہوتا ہے نہ کہ کسی مرض سے یا مرگی کے جھٹکوں سے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب اس

کی ضرورت ہوتی ہے۔اللہ نے بقول قرآن انسان کو"احسن تقویم" میں پیدا کیا ہے۔یہ احسن تقویم ہر وقت اس کی صحت جسمانی و ذہنی اور حسن فکر و عمل میں مدد معاون ہوتی ہے،لیکن بحران کی صورت میں اس کی معجز نمائی اپنی بلندیوں کو چھوتی ہے،بشرطیکہ فرد کی تعمیر سیرت میں خشت اول سیدھی رکھی گئی ہو۔صلاحیتیں تو ہمہ دم موجود ہوتی ہیں صرف ان کی بیداری،روئیدگی اور بالیدگی کی ضرورت ہے۔

گاندھی کے دل کی آواز (INNER VOICE) ہو یا مومن کے ضمیر کی صدا۔ہر وقت مرگی یا حملہ امراض کے بغیر رہنمائی کو موجود ہیں،ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالی سائنس دانوں،ماہرین علوم دنیا علماء کرام اور عوام الناس سب کی راہ نمائی فرمائے۔

ایک مسئلہ رہ جاتا ہے۔ارتقائی نمو

(EVOLUTIONERY DEVELOPMENT) یا ڈارونی تصریف (DARWINIAN ADAPTATION) کا جو اسی اخباری خبر میں اٹھایا گیا ہے۔ہر چند مندرجہ بالا بحث سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے لیکن کچھ نقاط اٹھانے میں کوئی قباحت نہیں۔

اگر"خدا پیا" ڈارونی تصرف کا نتیجہ ہی فرض کر لیا جائے تو بھی گزشتہ چند ہزار یا چند لاکھ یا چند کروڑ سال میں اس میں کسی تصرف کے شواہد نہیں ملتے۔کروڑوں سال پرانی آثار قدیمہ کی کھدائی میں ہر انجر پنجر کے ساتھ خدائی یا روحانی عقائد کے آثار بھی ملتے ہیں۔اس لئے ایمان، یقین یا عقیدے کا یہ تصور یا کیفیت مستقل اور مسلسل ہے۔تہذیبوں کے عروج و زوال کی نسبت سے اس کی نوعیت میں تو تغیر و تبدل ممکن ہے۔لیکن نفس عقیدہ یعنی کسی کیش یا مسلک کی طرف میلان یا کسی خدا پر ایمان غیر متبدل ہے۔

اس کھدائی کے عمل میں بے شمار قدیم (غالباً 30 لاکھ سال پرانے تک) انسانی ڈھانچے بازیافت ہوئے ہیں۔ہمارے علم کے مطابق تمام تر کوشش کے باوجود ابھی تک اس ڈارونی نظریئے کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ ابتدائی انسان طبیعی طور پر بتدریج ارتقائی عمل سے گزر کر جدید انسانی پیکر میں ڈھلا ہو۔جغرافیہ،آب وہوا،رنگ و نسل کے فرق کے علاوہ جو آج بھی موجود ہے اور کسی فرق کی شہادت نہیں ملی۔طبیعی ارتقاء (PHYSICAL EVOLUTION) کا تمام

علم قیاس وظن (CONJECTURE) پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیڑھ دو سو سال کی محنت شاقہ اور موضوعی کوششوں کے باوجود ہنوز "گم شدہ کڑی" (MISSING LINK) کی دریافت نہیں ہوئی اور جب تک یہ دریافت نہیں ہوتی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان بندر کی سطح سے ارتقاء پذیر ہو کر انسانی درجہ تک کس طرح پہنچا۔

یہ "گم شدہ کڑی" اگر واقعی موجود ہوتی تو اب تک اتنی صدیوں کی مسلسل عمیق اور دقیق تلاش کے بعد جبکہ فطرت بیتاب اسرار و رموز کی نمود و ظہور کے لئے صلائے عام دے رہی ہے، دریافت ہو چکی ہوتی حقیقت یہ ہے کہ اس "گم شدہ کڑی" کا کوئی وجود ہی نہیں ہے یہ محض ایک واہمہ ہے۔

ایک واہمہ۔ ایک حقیقت:۔ اگر یہ واقعی واہمہ ہے تو اس عقل و دانش کے دور میں بھی بعض لوگ اس پر بہ اصرار کیوں جمے ہوئے ہیں!

حقیقت یہ ہے کہ غلطی کا اعتراف اور اس سے اعراض سخت مشکل امر ہے۔ ازل میں ابلیس نے اپنی آتشی فطرت پر تکبر کر کے حکم ربی کو تسلیم کرنے اور آدم خاکی کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کیا اور وہ اپنی ضد پر قائم ہے۔

یہودیوں نے باوجود یکہ انہیں حضرت عیسیٰ کی آمد کا انتظار تھا ان سے انکار کیا اور دو ہزار سال سے اس واہمے میں گرفتار ہیں کہ "مسیح" کو ابھی آنا ہے۔

یہودی اور عیسائی دونوں دو ہزار سال سے اس واہمے میں مبتلا ہیں کہ عیسیٰ واقعی مصلوب کر دیئے گئے۔ لوگ تو اس واہمے میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان پر وحی یا الہام کا نزول ہوتا ہے اور لطف یہ کہ وہم کی یہ رو ان کے پیروکاروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لئے رکھتی ہے۔

یہ نفسیاتی طور پر مسلم امر ہے کہ آدمی بہ تکرار کذب بیانی کرتے ہوئے اسے سچ تسلیم کرنے لگتا ہے۔ غلطی کی تکرار مرور وقت سے عقیدے کا روپ دھار لیتی ہے اور چونکہ یہ حقیقت نہیں ہوتی اس لئے اسے واہمے کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

عقائد کتنے ہی غیر منطقی یا غلط کیوں نہ ہوں ان پر اصرار نیز رسوم و رواج قومی و نسلی اساطیر، مظاہر پرستی، اصنام پرستی اور CULTS وغیرہ کی اس مہذب دور میں بھی کمی نہیں۔ بڑی بڑی ترقی پسند اقوام کے افراد اپنے ہاتھوں سے مٹی اور پتھر کے بت تراش کر انہیں اوتار پیغمبر اور خدا

قرار دے کر ان سے عجیب وغریب کرامات منسوب کر کے ان کی عبادت کرتے اور ان سے حاجت روائی کے طالب دکھائی دیتے ہیں۔یہ واہمے جو ذہن انسانی میں دور ماقبل از تاریخ میں داخل ہوئے اس روشن زمانے میں بھی کن کھجورے کی طرح اس سے چپکے ہوئے ہیں۔

ہندوستان، ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا، امریکہ یا یورپ کا کون سا ملک ہے جہاں یہ توہم پرستی رائج نہیں؟ اس کا ترک قومی، نسلی یا مذہبی تفاخر کی نفی کے مترادف ہے، جو متعلقہ طبقوں کی انفرادی اور اجتماعی انا کو گوارا نہیں۔علوم کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج پر فائز لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں بلکہ یہ علل انکے خون میں اس درجے سرایت کر چکے ہیں کہ وہ زورعلم سے اس کی ایک سے ایک بڑھ کر توجیہ پیش کرنے میں پرجوش رہتے ہیں۔

نوع بشر کا بندر سے انسان کا ارتقاء بھی ایک ایسا ہی علمی واہمہ ہے،جس کا آغاز حقیقت کی جستجو میں ایک مفروضے سے ہوا لیکن اس کے عدم ثبوت کے باوجود بار بار تکرار کے باعث اس کا خالق ڈارون اور اس کے کچھ پیرو کار یقین کی حد تک اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ ان کی بات غلط نہیں ہوسکتی! اگر وہ اس سے دست بردار ہوتے ہیں تو نظریہ ارتقاء کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ گرتی ہے اور نا کامی کا یہ تصور کسے قابل قبول ہوسکتا ہے؟ آج تک کون سا واہمہ کہانت، مظاہر یا اصنام پرستی، اساطیر پر اعتقاد یا عقیدہ یا آبائی رسم ورواج ایسا ہے جو ایک بار شروع ہو کر ختم ہو گیا! اس کے کچھ نہ کچھ ماننے والے بمصداق وفاداری بشرط استواری ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔

''ارتقائے انسانی'' کی یہ گم شدہ کڑی بھی محض ایک ایسا ہی واہمہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے کمال خلاقی اور رحمت عالی سے براہ راست ''حسن تقویم'' کی مکمل و جامع صورت میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا، جیسا کہ فرمایا: **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم** (95۔التین۔4) ''ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں بنایا'' **ونفخ فیہ من روحہ** (32۔السجدہ۔9) ''اور اس میں اپنی روح پھونک دی'' اور اس بہترین سانچے کی تخلیق میں اس مخلوق یعنی انسان کی سب طبعی روحانی اور ذہنی صلاحیتیں، ان کی صلاحیت قبول، ترقی، نمو، روئیدگی، افزونی وبالیدگی غرضیکہ سبھی صفات شامل ہیں، اور یہ سب خالق انسان کے حرف قرآن سے ثابت ہیں۔

آج کل کی معجز نما سائنسی ترقی نے تو یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ ہر انسان کے انفرادی، پراسرار اور پر پیچ جوہری ذرات اپنے خواص موروثی کے ساتھ اور ربع دستورنمو (کوڈ) اس کے حیاتیاتی خلیوں میں محفوظ ہیں جیسے (DEOXYRIBONUCLEIC ACID) یا مخفف کے طور پر DNA کا نام دیا گیا ہے اس میں وہ نوع انسانی کے باقی تمام افراد سے منفرد و ممیز ہے اور اس کی وجہ سے اپنی الگ شناخت کا حامل ہے۔ (کیا یہ لوح محفوظ سے فرد کی تقدیر مرقومہ کا ایک ہلکا سا عکس تو نہیں؟) گویا تمام انسان ایک نوع ہونے کے باوصف اپنے اپنے طور پر علیحدہ علیحدہ اکائی ہیں اور انفرادی شناخت رکھتے ہیں اور یہ امر سائنسی طور پر مسلم الثبوت مانا جاتا ہے۔

بلکہ گزشتہ دنوں ٹی وی کے نیشنل جیوگرافک چینل پر ایک ماہر آثار قدیمہ خاتون سے جب وہ پہاڑی کی ڈھلان پر بیٹھی لکھوکھا سال پرانے ایک خاتون کے ڈھانچے پر محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھیں یہ چشم کشا اور ایمان افروز تبصرہ بھی سنا کہ تمام عورتیں خواہ زمین کے کسی بھی خطے پر گزری ہوں اور ان کا کسی رنگ و نسل سے بھی تعلق رہا ہو ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔

اللہ اکبر! اب یہاں سے یہ منزل کتنی دور ہے جب یہ تسلیم کرلیا جائے گا کہ "تمہارے رب نے تم کو نفس واحد سے پیدا کیا پھر اسی (واحد) سے اس کا جوڑا خلق کیا اور پھر ان سے بے شمار مرد اور عورت پیدا کئے" (4 النساء۔1) جن کی اولاد سب نوع انسانی ہے۔

جب نوع انسانی کا ہر فرد دوسرے سے الگ ایک منفرد ذات ہے تو اسکی پوری نوع کے دوسری انواع مخلوقات سے الگ اور منفرد ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے۔ صریحاً واضح ہے کہ انسان نہ صرف تمام مخلوقات کائنات (حیوانات، نباتات، اجرام فلکی، آب و آتش و ہوا وغیرہ سب) سے مختلف ہے بلکہ وہ نوع حیوانات بشمول ڈارون کے عم زاد بندر وغیرہ سے بالخصوص الگ، منفرد، ممتاز و ممیز مخلوق ہے بلکہ صاحب نطق، صاحب علم و شعور، صاحب فکر، صاحب ارادہ، صاحب قلم اور صاحب احسن تقویم ہونے کے سبب برتر و اعلیٰ یعنی اشرف المخلوق ہے اور اسی باعث مسجود ملائک اور نیابت الٰہی کے منصب پر فائز ہے۔

اس کے باوجود حیرت ہے کہ جو بات ظن و تخمین کی گرد میں ملفوف ہے سائنس کے بعض اہل علم اسے تو حرز جان بنائے ہوئے ہیں اور وہ حق جو دلائل و براہین سے روز روشن کی طرح عیاں

ہے اور مشاہدات وسائنسی تجربات سے ثابت ہے لکیر کے فقیر ہونے کے باعث اس سے منکر یا قبول کرنے میں متامل ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ بے یقینوں کو روشنی کی کرن تو کیا اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا۔

سورہ نور میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

ترجمہ:۔"اور کافروں کی کیفیت ایسی ہے جیسے گہرے سمندروں کے گھپ اندھیرے کو ایک (بڑی) موج نے نے ڈھانپ لیا۔ پھر اس موج کے اوپر (ایک اور) موج (چھا گئی) ہو۔ (پھر) اس کے اوپر بادل ہو (غرض) اوپر تلے (تہ درتہ) اندھیرے ہیں۔ اگر کوئی اپنا ہاتھ بھی نکالے تو سجھائی نہ دے دل کی سیاہی کا یہ عالم ہو تو) جس کو اللہ ہی نور (ہدایت) نہ دے (یعنی وہ خود حصول نور ہدایت کی طرف پیش قدمی نہ کرے) تو اس کے لئے (کہیں سے حصول) نور (کی صورت) نہیں" (24۔النور۔40)

اور تمام تر تحقیق و تدقیق کے باوجود جب تک وہ نور ایمان سے منور نہ ہوں گے اور اپنے اندر کے خدا یا کو متحرک نہ کریں گے ظن و تخمین اور قیاس و گمان کے اندھیروں میں تہ بہ تہ گم و سرگرداں رہیں گے کیونکہ کائنات کی معرفت کا نور جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ خالق کائنات کی تسلیم و بندگی کی مشعل دل کے اندر روشن کی جائے۔

منشور انسانیت:۔ اس کا آسان علاج حل یا جواب اللہ تعالیٰ کی ذات لاشریک میں ایمان ہے۔ جو بدیع السموات والارض ہے جو خالق و باری ہے جو حی و قیوم ہے اور محی و ممیت ہے جو علیم و خبیر ہے جس نے انسان کو احسن تقویم میں خلق کر کے اسے اشرف المخلوق اور علم سے بہرور فرما کر مسجود ملائک کے مرتبے پر سرفراز فرمایا اور زمین میں اسے اپنی نیابت کا شرف بخش کر اسے یہ منشور عطا کیا:

"اور ہم نے (آدم) کو حکم دیا کہ تم سب نیچے اتر جاؤ (جسمانی طور پر جنت سے اور روحانی طور پر جس تقویم کی کیفیت سے) پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے (اور وہ یقیناً پیغمبروں کو وحی اور کتابوں کی صورت میں پہنچے گی) تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا (ایمان لائے گا اور عمل کرے گا) سو ان کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین

ہوں گے''۔(2۔البقرہ۔38)

''بیشک تمہارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو (عدم محض سے وجود میں لاکر) پیدا کردیا چھ دنوں میں پھر قائم ہوگیا عرش پر (اس کا جاہ وجلال کائنات پر قائم ہوگیا) ڈھانپ لیتا ہے رات سے دن کو اور وہ (رات) جلدی سے اسے (دن کو) آلیتی ہے اور سورج اور چاند اور ستاروں کو اسی نے پیدا کیا۔سب اسی کے حکم کے تابع ہیں۔یاد رکھو اسی کے لیے خاص ہے آفرینش (بھی) اور حکومت (بھی) برکت سے بھرپور ہے اللہ سارے جہانوں کا پروردگار۔اپنے رب سے دعا کرو عاجزی کے ساتھ اور چپکے چپکے سے بے شک وہ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور زمین میں اس کی اصلاح (عدل وامن) کے بعد فساد نہ مچاؤ اور اللہ کو پکارتے رہو خوف کے ساتھ (بھی) اور آرزو (امید لطف وکرم) کے ساتھ (بھی) بے شک اللہ کی رحمت احسان کاروں کے بہت قریب ہے''(7۔الاعراف۔66)''ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرتے رہو اور گناہ اور زیادتی (ظلم وجبر،فتنہ وفساد) میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔بے شک اللہ سخت سزا دینے پر قادر ہے''(5۔المائدہ۔2)

''اور لازم ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت (موجود) رہے جو نیکی کی طرف بلایا کرے اور بھلائی کا حکم دیا کرے اور بدی سے روکا کرے اور یہی لوگ ہیں جو (اللہ کے نزدیک،دین ودنیا دونوں میں) کامیاب ہیں''(3۔آل عمران۔104)

ذرا تھم جایئے ڈاکٹر ولایانز راماچندرن کی تحقیق میں جس ''خدا پیا''روحانی تجربات کا عکس ہے اور ڈارونی تصرف میں نوع انسانی کے افراد کے درمیان جس ہم آہنگی کی حوصلہ افزائی ہے وہ کہیں تکوین کے اس منشور میں تو نہیں جھلک رہی ہے!اگر ایسا ہے تو یقیناً راماچندرن یا ڈارون کو ظلمت قیاس میں ناٹک ٹوئیے مارنے کی بجائے نور ایمان کی روشنی سے فیض یاب ہونا چاہیے۔

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت)

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی انفرادیت

1۔ دوسرے سلسلوں کی روحانی معراج اور آخری منزل کشف و کرامات کا حصول ہے لیکن ہمارے سلسلہ میں اُنکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے سلسلہ کا آخری مقصد اللہ کا قرب، عرفان اور لقاء کا حصول ہے۔

2۔ بزرگان عظام اور اولیائے کرام کی کرامات برحق اور انکی دعاؤں کی مقبولیت مسلم لیکن ہم مشکل کشاء اور حاجت روا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو مانتے ہیں۔

3۔ موجودہ دور کی مصروف زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے مختصر اور سہل اوراد و اذکار تلقین کیئے جاتے ہیں۔

4۔ ہمارے سلسلہ میں مجاہدہ کیلئے غصہ اور نفرت کو مکمل طور پر نفی کرنے اور عالمگیر محبت اور صداقت کو اختیار کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے۔ یہ تربیت گھر کی چاردیواری کے اندر احسن طریقے سے ہوسکتی ہے۔

5۔ بانی سلسلہ توحیدیہ کے وصیت نامہ کے مطابق سلسلہ توحیدیہ کے روحانی پیشوا کا منصب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غیر وارثتی ہوگا۔

6۔ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی تعلیم مذہبی گروہ بندیوں اور فرقہ واریت سے بالاتر اور وسعت قلب و نظر کی مظہر ہے۔

7۔ ہمارے سلسلہ میں مریدوں کی تعداد بڑھانے کیلئے اندھا دھند بیعت نہیں کیا جاتا ہر شخص کو بیعت کرنے سے پہلے کم از کم چھ ماہ طالب رکھا جاتا ہے تاکہ وہ جماعت کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہو کر داخل سلسلہ ہو۔

8۔ سلسلہ توحیدیہ میں متوازی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جس میں نہ تو دنیا کو ترک کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی اس میں غرق ہوجانے کی۔

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف

قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔
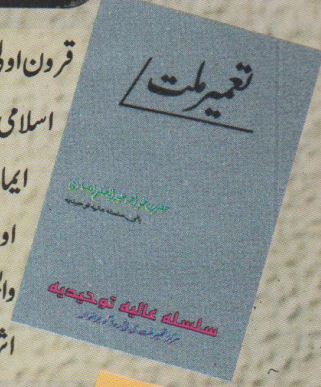
کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔
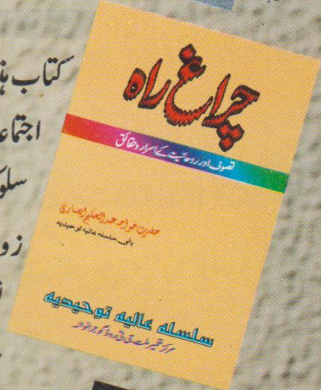
یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کرکے
ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔
مصنفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان
زبان میں بیان کر دیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:۔
حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقا اور ترقی کیلئے دین
کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا
اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔

Website: www.toheedia.net